آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اکتوبر 2019

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/₹10

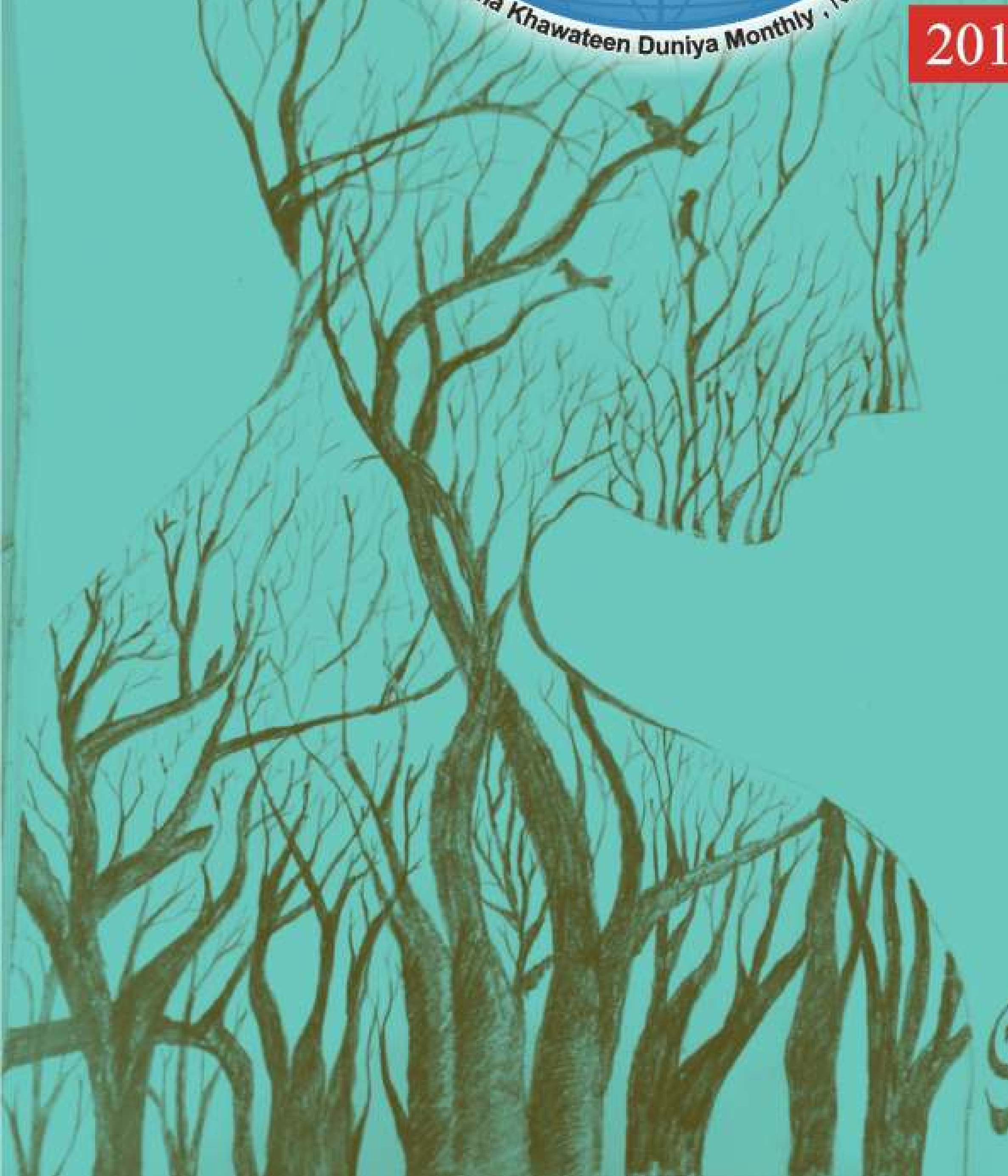

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

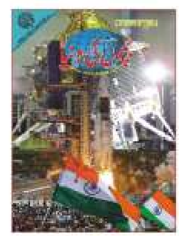

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

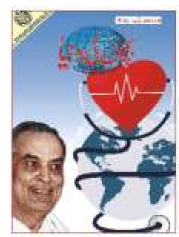
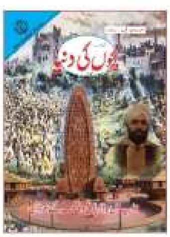

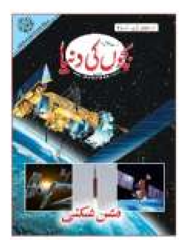

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:3 شمارہ: 10 اکتوبر 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی۔ 110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں
سرورق: گلشن آرا

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	ندا فاضلی کی شاعری	فرزانہ خانم	5
پرواز کے نئے آسمان	تحقیقی دنیا میں گورکھپور کی بیٹی نے رقم کی ایک نئی تاریخ	جمال احمد خان	8
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		10
جہان نسواں	سرسید ایک نظر میں	خدیجہ خاتون	11
	عصمت آپا کی کہانی ان کی زبانی	رفعت جمال	15
	امراؤ جان ادا: ایک جائزہ	ڈاکٹر شبنم رضوی	21
	زردوزی کی تاریخ: حیدرآباد کی مسلم زردوزی کاریگر خواتین کی ابتر صورت حال	ڈاکٹر اسماء انجم	24
	نظام زمینداری کا بیانیہ "شب گزیدہ"	صبا رحمٰن	28
	اردو ڈرامے کے فن میں اسٹیج کی اہمیت	عالیہ بیگم	33
	ادبی کوئز	شگفتہ یاسمین	38
قانون میں خواتین	خواتین کی تعلیمی پسماندگی	خواجہ عبدالمنتقم	41
کہانیاں	اٹوٹ رشتہ	ترنم جمال	43
	ملن	سیدہ تبسم منظور ناڈکر	45
	آئینہ	ڈاکٹر فریدہ تبسم	47
حسن سخن	تحسین کاظمی		49
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		50
صحت	بریسٹ کینسر	انصاری اسماء بانو سلیم اختر	52
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		57
تاثرات	نگر نگر سے		59

مشعل

زبان ذریعۂ اظہار ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف زبانوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ان زبانوں کے ذریعے نہ صرف نئی تہذیب نے جنم لیا بلکہ پرانی اقدار کو نئے سرے سے سمجھنے میں بھی مدد ملی۔ زبان کسی بھی قوم و ملک کی تعمیر و ترقی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ زبان دلوں کو جوڑتی ہے۔ سماجی بیداری میں بھی زبان اہم رول ادا کرتی ہے اور امن و مفاہمت کی راہ ہموار کرنے میں بھی زبان کا اہم رول ہوتا ہے۔

زبان کوئی بھی ہو اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے۔ زبان کسی ذات یا مذہب کی نہیں ہوتی۔ اسے کسی بھی مذہب، ذات یا طبقہ سے جوڑ کر نہیں دیکھا جانا چاہیے۔ زبانوں کا باہمی رابطہ بہت اہم ہے۔ اس کے توسط سے مختلف زبانوں کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے کے کام بھی آتے ہیں۔ ہمارا ملک ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں مگر چوں کہ زبانوں کے باہمی رشتے ہیں، اس لیے زبانیں مل کر ملک کو مضبوط بناتی ہیں۔ اسی لیے ماہرین لسانیات اور دانشوران نے ملک کی تمام زبانوں کو ملک کی طاقت کہا ہے اور مختلف سرکاروں نے انھیں زندہ رکھنے کے لیے مقدور بھر کوششیں بھی کی ہیں۔ حالانکہ بعض عناصر کے ذریعے زبانوں کے حوالے سے کچھ پیچیدگیاں بھی پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔

گاندھی جی نے زبانوں کی پیچیدگی کے مسئلے کے لیے بیچ کا راستہ اختیار کیا تھا۔ انھوں نے زبانوں کے حق میں جو بات کہی وہ یہ تھی کہ زبان کی ترقی کے بغیر ملک بھی ترقی نہیں کرسکتا۔ زبانوں کے ذریعے ہی ملک و قوم کی ترقی ممکن ہے۔ انھوں نے کبھی بھی ہندی اور اردو کو الگ زبان نہیں سمجھا بلکہ وہ ان دونوں کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے رہے اور ہندی اور اردو کے آپسی روابط کی بات کرتے رہے۔ ان کی نظر میں اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں تو تھیں لیکن ملک کے لیے انھوں نے دونوں ہی کے وجود کو ضروری خیال کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ تمام زبانوں کا احترام کیا جانا چاہیے۔

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں بہت سے مشترک الفاظ نظر آتے ہیں۔ یہ الفاظ ان دونوں زبانوں میں ہمیشہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کے ذریعے اردو اور ہندی کے لسانی رشتے کا پتہ چلتا ہے۔ اردو زبان ہندی سے مماثلت بھی رکھتی ہے۔ محاورے اور نجی زندگی میں بولے جانے والے ہندی کے بہت سے الفاظ اردو سے مطابقت رکھتے ہیں۔ دونوں زبانوں نے ہندوستان میں ہی جنم لیا۔ یہی ان کی جنم بھومی ہے۔ آج اردو اور ہندی مشترکہ وراثت کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ جہاں تک اردو زبان کی بات ہے تو دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے قومی اتحاد، یگانگت، قومی یکجہتی اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہندی بھی مختلف مذاہب اور نظریات کے لوگوں کو باہم جوڑتی ہے۔ لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو اور ہندی کے آپسی رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے نئے نئے لائحہ عمل تیار کیے جائیں اور اردو کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کو بھی فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔

ہمارے ملک کی موجودہ حکومت بھی زبانوں کی ترقی کو لے کر بہت پرعزم ہے۔ حکومت زبان کے تئیں بہت سنجیدہ ہے اور اس کے فروغ کے لیے حتی الامکان کوششیں بھی کر رہی ہے۔ حکومت نے اس بات کی بھی یقین دہانی کرائی ہے کہ ملک کی تمام زبانوں کے فروغ کے لیے عملی اقدام کیے جائیں گے۔ زبان کے تحفظ اور فروغ کے لیے کچھ نئی تجاویز کو بھی منظوری دی جائے گی جس کے تحت کچھ نئی اسکیموں کو نافذ کیا جائے گا تاکہ زبانوں کے تحفظ اور فروغ کی کوششوں کو عملی طور پر ممکن بنایا جاسکے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

فرزانہ خانم

ندا فاضلی کی شاعری

ندا فاضلی کی شاعری کے تعلق سے ایک سوال اکثر اُٹھایا جاتا ہے کہ وہ جدید لہجے کے شاعر ہیں یا ترقی پسند رجحان کے حامل، لیکن ان کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ جدید بھی ہیں اور ترقی پسند بھی:

گرجا میں مندروں میں اذانوں میں بٹ گیا
ہوتے ہی صبح آدمی خانوں میں بٹ گیا

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

سبھی کی نظروں سے غائب تھا جو وہ حاضر تھا
کسی نے مڑ کے نہیں دیکھا آدمی کی طرف

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

راکشس تھا نہ خدا تھا پہلے
آخری سانس تک بے قرار آدمی

ان اشعار سے ان کی ترقی پسندی نمایاں ہے لیکن ان کے یہاں وہ گھن گرج نہیں جو ترقی پسندوں کے یہاں ہے۔ اُن کے یہاں متوازن اور معتدل رویہ ہے۔ وہ سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج تو کرتے ہیں لیکن جذبات میں نہیں بہتے بلکہ جذبات کو قابو میں رکھتے ہیں۔ مذہب کے تئیں بھی اُن کا رویہ ترقی پسندوں سے قدرے مختلف ہے۔ آدمی ان کے یہاں ایک نئے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے:

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو، کئی بار دیکھنا

یہ شہر ہے کہ نمائش لگی ہوئی ہے کوئی
جو آدمی بھی ملا، بن کے اشتہار ملا

کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی عیسائی ہے
سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

خوش حال گھر، شریف طبیعت، سبھی کا دوست
وہ شخص تھا زیادہ مگر آدمی تھا کم

ندا فاضلی نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ بہت دکھ جھیلیں، سڑک کے پلیٹ فارم پر بھی زندگی بسر کی۔ روزی روٹی کے لیے در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ اپنوں سے بیگانگی بھی محسوس کی۔ رشتوں کو ٹوٹتے

بکھرتے بھی دیکھا۔ اپنوں کی جدائی میں آنکھیں بھی روئیں، دل مغموم بھی ہوا۔ تنہائی کا کرب بھی جھیلا اسی لیے وہ کہتے ہیں:

دنیا جسے کہتے ہیں، جادو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے، کھو جائے تو سونا ہے

مسمار ہو رہی ہیں دلوں کی عمارتیں
اللہ کے گھروں کی حفاظت نہیں رہی

صرف آنکھوں ہی سے دنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ندا فاضلی جس سے بھی ملے ٹوٹ کر ملے۔ دوستی، وفاداری، خلوص، محبت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ کسی کی دل آزاری نہیں چاہتے تھے۔ سب میں پیار بانٹنا چاہتے تھے۔ رشتوں کو نبھانا جانتے تھے۔ اُن کے یہاں فاصلے کا تصور قطعی نہیں تھا وہ دوستی میں یقین رکھتے تھے:

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے
جانے کب چاند بکھر جائے گھنے جنگل میں
گھر کی چوکھٹ پہ کوئی دیپ جلاتے رہیے

فاصلہ نظروں کا دھوکہ بھی تو ہو سکتا ہے
وہ ملے یا نہ ملے، ہاتھ بڑھا کر دیکھو

شاد عظیم آبادی کا ایک مشہور شعر ہے:

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ندا فاضلی نے بھی اسی طرح کا ایک شعر کہا ہے:

یہی ہے زندگی کچھ خواب چند امیدیں
انھیں کھلونوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

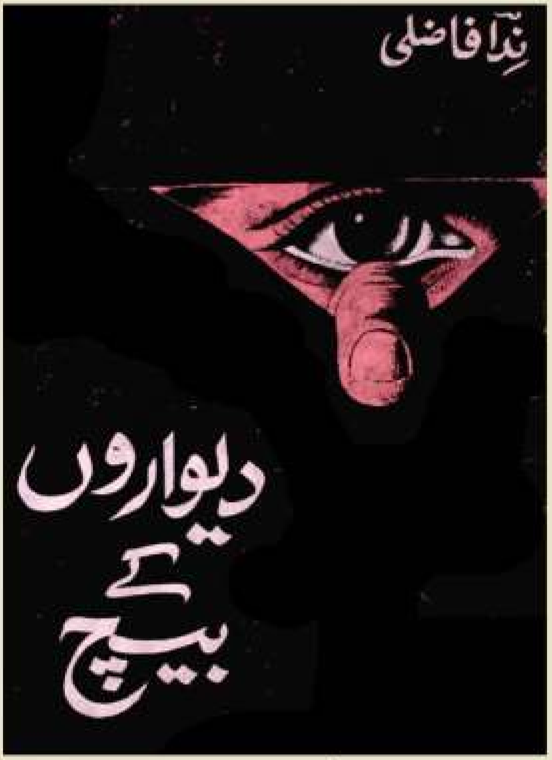

دوسرے شعر میں زندگی کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں زندگی کے کئی معنی ہیں۔ زندگی کے خارجی مسائل اور حادثات نے انسان کو بے بس اور بے مروّت بنا دیا ہے۔ آدمیوں کے اس جنگل میں انسان نہیں بھیڑیوں کا ہجوم ہے جس میں انسانیت روز بروز پامال ہو رہی ہے۔ ہر آدمی ایک دوسرے کو گرا کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ تصنع اور خود غرضی اس طرح نمایاں ہوگئی ہے کہ انسانیت سسک رہی ہے۔ مسجد اور مندر کے جھگڑے میں لفظوں کا پُل ٹوٹ چکا ہے:

چند لمحوں کو ہی بنتی ہیں مصور آنکھیں
زندگی روز تو تصویر بنانے سے رہی

ہر راستہ انجان سا، ہر فلسفہ نادان سا
صدیوں پرانی ہے مگر ہر دن نئی ہے زندگی

مٹی ہَوا لے کر اُڑی، گھومی پھری واپس مڑی
قبروں پہ کتبوں کی طرح لکھی ہوئی ہے زندگی

ندا فاضلی اپنے مضمون 'میرا تخلیقی سفر' میں لکھتے ہیں کہ ''ہر آدمی ایک ہی زندگی میں کئی زندگیاں جیتا ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی دیکھنے والی نظر یا نظر آنے والی دنیا پہلے سے مختلف ہوتی ہے۔''

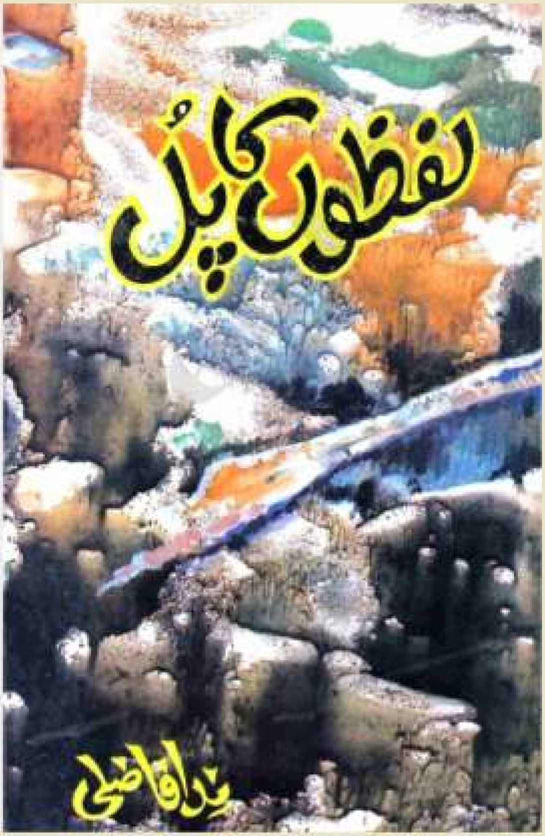

ندا فاضلی زندگی کے واقعات و حادثات سے اپنے اشعار کا خمیر تیار کرتے ہیں۔ ان حادثات اور واقعات کے مرکز میں صرف اور صرف انسان ہوتا ہے۔ یہ انسان کبھی واضح اور کبھی استعارے کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے:

وہ آدمی جو میرا گھر جلانے آیا تھا
مری ہی طرح سے بے خانماں لگا مجھ کو

ایسا نہیں ہے کہ ندا فاضلی کے یہاں عشق کا تصور نہیں ہے۔ عشق کے مختلف رنگ بھی ندا فاضلی کے یہاں موجود ہیں۔ وہ عشق کو روایتی انداز سے نہیں برتتے بلکہ عشق کا ایک نیا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں محض ایک لڑکی سے عشق نہیں ہے بلکہ عشق کا رنگ جدا جدا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تمھارا ساتھ غنیمت ہے آج بھی لیکن
تم آئے تھے تو لگا تھا کوئی کمی نہ رہی

عشق کی عمر کم ہی ہوتی ہے
باقی جو کچھ ہے دوستانہ ہے

اک عشق نام کا جو پرندہ خلا میں تھا
اترا جو شہر میں تو دو کانوں میں بٹ گیا

عشق کرکے دیکھیے، اپنا تو ہے یہ تجربہ
گھر، محلہ، شہر سب پہلے سے اچھا ہوگیا

مدتوں کے بعد دیکھا تھا اسے اچھا لگا
دیر تک ہنستا رہا وہ اپنی عادت کے خلاف

ندا فاضلی کی شاعری میں کئی شیڈس ہیں۔ اسی میں ایک شہر بھی ہے۔ شہر کا ایک اپنا مقام ہے۔ شہر زندگی کا کرب جو وہ برسوں سے جھیل رہے ہیں۔ ذات کی شکست و ریخت کا احساس اور جھنجھلاہٹ، محبت اور اس کی ناکامی کے سماجی و معاشی اسباب و علل، عہد حاضر کی خود غرضی اور مطلب پرستی، دوسرے کو گرا کر خود آگے بڑھنے کی روش، انسانیت اور امن پسندی کے خواب اور ان کا انتشار یہ تمام امور ان کی شاعری میں محسوس کیے جاسکتے ہیں:

یہ شہر ہے کہ نمائش لگی ہوئی ہے کہیں
جو آدمی بھی ملا بن کے اشتہار ملا

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

میرے تیرے چولھوں میں اتنی آگ نہیں تھی
جس سے سارا شہر جلا ہے، کوئی پرچم ہوگا

ندا فاضلی کا شعری سفر خوبیوں سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے جو زندگی جی اسے ہی شعر میں ڈھالا، جو کھویا، جو پایا سب کچھ اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا۔

تم جو سوچو وہ تم جانو، ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

□□□

Farzana Khanam
P.O.+P.S.: Pakri Barawan,
Distt.:Nawadah-805124(BIHAR)

جمال احمد خان

تحقیقی دنیا میں گورکھپور کی بیٹی نے رقم کی ایک نئی تاریخ

گورکھپور سے تعلق رکھنے والی طالبہ عفت امین بنیں روشن ترین مواد تلاش کرنے والی پہلی سائنسدان

گورکھپور یونیورسٹی کی تحقیقی طالبہ عفت امین نے اب تک دنیا کا سب سے روشن مواد دریافت کیا ہے۔ یہ تحقیق جاپان کے کیوشوانسٹی ٹیوٹ آئی آئی ٹی چنئی اور سی ڈی آر آئی لکھنؤ کے لیب ٹیسٹ میں بھی کامیاب پائی گئی ہے۔ یوپی کے وزیر اعلی نے اس کامیابی پر ریاستی حکومت کی جانب سے عفت امین کو مبارکباد دی ہے۔ وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ کے آبائی شہر گورکھپور (یوپی) میں دین دیال اپادھیائے یونیورسٹی کی طالبہ عفت امین نے اپنی تازہ دریافت سے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ عفت نے دنیا کا سب سے روشن مادہ دریافت کیا ہے۔ جانچ کے بعد IIT چنئی اور جاپان کے کیوشوانسٹی ٹیوٹ نے بھی اس تحقیق کامیابی کی تصدیق کردی ہے۔ اس اہم دریافت کی وجہ سے اس مواد کے استعمال سے اب دو واٹ ایل ای ڈی سے 20 واٹ لائٹ کی روشنی ہوگی۔ تحقیق کے دوران کیمسٹری کی ریسرچ اسکالر عفت نے لینتھے نائیڈ سیریم، پروکوڈومیم اور نیوڈائیم میں پائرا جلیین تھائی ڈائیو کار بامیٹ کو آپس میں ملایا۔ ان کو ملا کر انھوں نے مجموعی طور پر 48 کمپلیکس بنائے۔ بار بار انھوں نے مختلف چمکیلی روشنی کا تجربہ کیا۔ نتائج بہترین رہے۔ اس سے قبل ان کی تحقیق کے آغاز کے دو سال ان کی ترکیب، اطلاق، نادر، صرف، عناصر وغیرہ کو اکٹھا کرنے اور سمجھنے میں ہی لگ گئے۔ اس کے بعد عفت نے مزید تین سال تحقیق میں گزارے۔ یہ تحقیق اب پانچ سال میں مکمل ہو چکی ہے۔ اس کمپلیکس کی چمک 9.91 فیصد ہے۔ اب تک بنے سارے چمکیلے کمپلیکس کی صلاحیت 80 فیصد تک تھی۔ اب تک بین الاقوامی جرائد میں عفت امین کے کل چار تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں انگلینڈ میں رائل سوسائٹی آف کیمسٹری، کئی ممالک سے شائع ہونے والا الوائرر، جرنل ٹیلر اور فرانسس وغیرہ شامل ہیں۔ انھیں تحقیق کے لیے گرو گورکھناتھ ریسرچ میڈل مل چکا ہے۔

عفت امین کے پروفیسر امیش ناتھ ترپاٹھی کا کہنا ہے کہ اس بات کا پتہ اس وقت چلا جب برائٹ کمپلیکس کے مرکب کو IIT چنئی، سی ڈی آر آئی لکھنؤ اور کیوشو انسٹی ٹیوٹ جاپان میں لیب ٹیسٹ میں بھی کامیاب پایا گیا ہے۔ عفت کی تحقیق سے روشنی کی دنیا میں ایک اور انقلابی تبدیلی آنے والی ہے۔ اس چمکیلے مواد کو استعمال کرنے سے نامیاتی ایل ای ڈی بلب بنائے جاسکیں گے۔ جو صرف ایک یا دو واٹ کے کرنٹ سے بہت زیادہ روشنی فراہم کریں گے۔ اس کے استعمال سے راڈار میں توانائی کے خرچ میں کافی کمی آئے گی۔ ایم آر آئی میں بھی اس کے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ یہ مادہ غشیات اور حیاتیاتی نظام کے ٹیسٹ میں بھی کارآمد ثابت ہوگا۔ تحقیق کے دوران عفت کو بھی مختلف قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ملک میں آج بھی سائنسی ٹیسٹ سے متعلق بہت سارے کیمیکل دستیاب نہیں ہیں۔ جنھیں بیرون ملک سے خریدنا بہت مہنگا ہے۔ نیز ان میں کافی زیادہ وقت بھی برباد ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے دو سال لگاتار ناکامیوں میں گزرے۔ اس دوران انھوں نے سو سے زیادہ غلطیاں کیں۔ لیکن محنت کے ساتھ وہ انھیں ایک ایک کر کے درست کرتی رہیں۔ ویسے تو ہندوستان کے سائنسدان ناسا سے لے کر پوری دنیا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ لیکن اب تحقیقی طالب علم عفت امین کی دریافت نے ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ عفت کا تعلق سی ایم نگری گورکھپور سے ہے۔ امین اللہ انصاری کی بیٹی عفت ڈی ڈی یو گورکھپور میں کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی طالبہ ہیں۔ انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے بی ایس سی اور ایم ایس سی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کے والد ٹھیکیدار اور والدہ استانی ہیں۔ دو بھائی اور دو بہنوں میں عفت سب سے چھوٹی ہیں۔ عفت نے اپنی ریسرچ کیمسٹری کی پروفیسر افشاں صدیقی کی زیر نگرانی مکمل کی ہے۔

Yogi Adityanath
@myogiadityanath | 5,013,625 followers

बहुत बधाई इफ्फत अमीन।
आपने गोरखपुर और उ.प्र. का नाम रोशन करने के साथ ही देश और प्रदेश के युवाओं के लिये एक अनुकरणीय प्रतिमान स्थापित किया है।
आप जैसे युवा ही एक नए और सशक्त भारत का निर्माण कर रहे हैं।
उ.प्र. की जनता और सरकार आपके साथ है।
आपको सुनहरे भविष्य के लिए शुभकामनाएं।

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ نے عفت کو مبارکباد دیتے ہوئے ٹویٹ کیا اور لکھا۔ بہت بہت مبارک ہو عفت امین۔ آپ نے اتر پردیش اور ہندوستان کا نام روشن کیا ہے۔ آپ کی تلاش ہمارے ملک اور ریاست کے نوجوانوں کو متاثر کرے گی۔

(بشکریہ: صدائے ہند نیوز، گورکھپور، اتر پردیش)

شاعرات کے منتخب اشعار

گلشن ترے بغیر نہ صحرا ترے بغیر
اس عشق نے کہیں کا نہ رکھا ترے بغیر

تجھے کیا بتاؤں مخفی کہ مری غزل ہے کیسی
کبھی درد کا فسانہ، کبھی عشق کا ترانہ

صالحہ بیگم مخفی

تجدید ملاقات بڑے کام کی نکلی
دیکھا جو دوری تھی فقط نام کی نکلی

کچھ ان کا تغافل بھی تھا کچھ اپنا تساہل
اور تھوڑی کسر گردش ایام کی نکلی

سعیدہ عروج مظہر

کیا تقاضہ کیجیے ان سے نگاہ لطف کا
بے نیازی ہے وہاں، یاں سوگواری ان دنوں

پھر بہار آئی ہے جی اڈا ہے یاد دوست میں
دل کرے زاری اور آنکھیں اشک باری ان دنوں

حیا لکھنوی

نہ آنسو ہیں نہ آہیں ہیں نہ بیداری ہے راتوں کی
مجھے معلوم ہے کیسے کٹی ہے ساعتیں مری

میں ایک ذرۂ ناچیز تھی رہی یوں ہی
وہ لوگ تھے جو ترے غم میں بن گئے موتی

بیگم رضیہ حلیم جنگ

کسی کے حسن جہاں تاب کا نکھار ہیں ہم
چمن کا حسن ہیں رنگینیٔ بہار ہیں ہم

بہ ایں کشا کش حرماں بہ ایں غم دوراں
کسی کے چشم کرم کے امیدوار ہیں ہم

صفیہ شمیم

کانوں میں گونجتی ہے بڑی آشنا صدا
ویران بستیوں میں غزل خواں کوئی تو ہے

بجھی بجھی سی نگاہیں غبار ہے کہ دھواں
وہ راستہ ہے کہ اپنا بھی نقش پا نہ ملے

ادا جعفری

تری دنیا میں رہ کر کیا کریں گے
خدایا عمر بھر رویا کریں گے

فراق یار نے کچھ ایسا حال زار کیا
ملول دل نے کیا غم نے بے قرار کیا

رابعہ سلطانہ ناشاد

نہیں احساس شاید کچھ تمھیں میری وفاؤں کا
کہ دیکھی جب کبھی تم نے فقط تقصیر ہی دیکھی

اضطراب دل میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہیں
اور سکون دل سے بھی جیسے کہ گھبراتی ہوں میں

زبیدہ تحسین

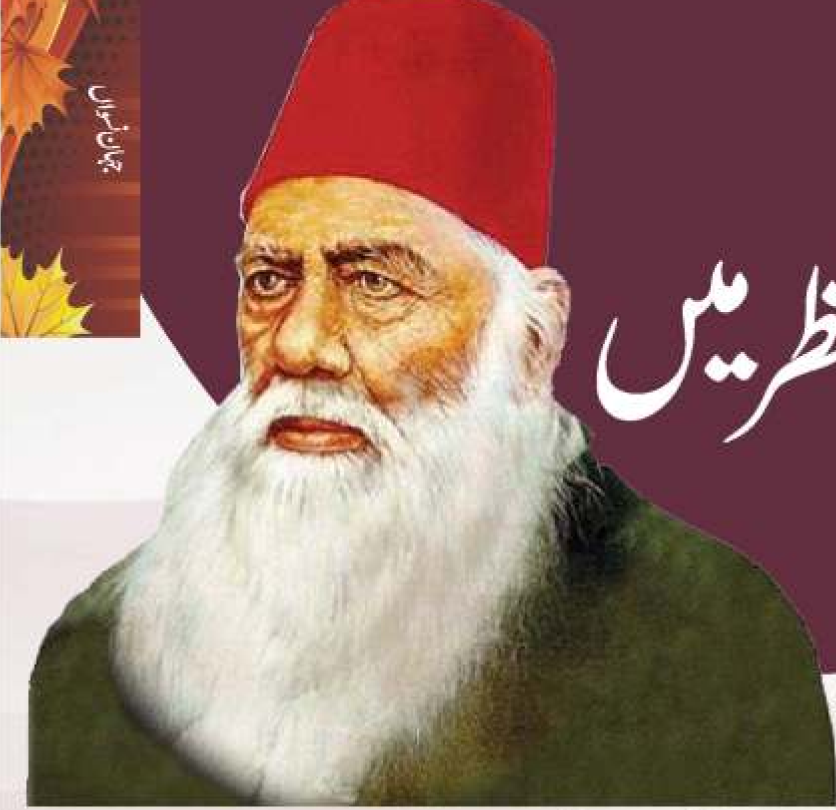

سرسید ایک نظر میں

خدیجہ خاتون

قوم کی سنہری تاریخ میں چند اشخاص ہی ایسے گذرے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے ایک گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں، اور لوگ طویل مدت تک ان کے افکار و خیالات اور ان کے ذریعے کی گئی خدمات سے استفادہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ سرسید کا نام اسی تعلق سے عزت و تعظیم سے لیا جاتا رہا ہے۔ سرسید کی شخصیت میں دلچسپی کا آغاز ان کے نام سے ہی ہو جاتا ہے، جنھوں نے قدامت پرستی، توہم پرستی، لاعلمی، اندھی تقلید، روایت پرستی اور جہالت کے خلاف اپنی آواز کو بلند کیا اور جدید ہندوستان کی تعمیر و ترقی، اصلاح اور نشو نما کی راہیں ہموار کیں۔ سرسید احمد خاں صرف ایک مصلح شعبۂ تعلیم کے انقلابی اور سیاست داں ہی نہیں تھے، بلکہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی معاشی فکر کی ترقی میں بھی کلیدی حیثیت کے حامل تھے۔

سرسید جفاکش شخصیت کے مالک تھے وہ جس کام کی جانب متوجہ ہوتے اسے نہایت ہی مستعدی اور تندہی سے تکمیل کو پہنچاتے تھے۔ ان کی زندگی کے بے شمار ایسے واقعات ہیں جب انھوں نے اپنی جان و مال کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے صرف کر دیا۔ سرسید برصغیر کی چند شخصیات میں سے ایک ہیں، جنھیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے، اور جو اپنے فکر و عمل سے تعمیری اور ذہنی انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ ایسے باوقار اور مخلص شخص کی زندگی کے حالات سے واقفیت نہ صرف ہمیں ان کے کارناموں سے روشناس کراتی ہے بلکہ بڑی حد تک انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے ساتھ زندگی گزارنے کا درس بھی دیتی ہے۔

1857 کا انقلاب جو برطانوی حکومت کے خلاف آواز بلند کرنے کی پہلی کوشش تھی، اس انقلاب کے بعد برطانوی حکومت نے ملک کو انتقامی آگ کے شعلوں میں دھکیل دیا۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ انسان ظلم اور بربریت کا شکار ہو گئے۔ سرسید نے ناامیدی میں امید کے ساتھ علم کی شمع کو تھامے ہوئے ملک کو اندھیرے سے روشنی کی جانب لانے کے لیے بے شمار صعوبتوں اور مشکلوں کو برداشت کیا۔ انھوں نے قوم کی اصلاح کے لیے جدو جہد کی راہ اختیار کی۔ غدر کے بعد 1864 میں ”سائنٹفک سوسائٹی“ کے قیام نے پورے ملک میں ان کے اصلاحی کاموں کو واضح کر دیا۔ جب انھوں نے ”سائنٹفک سوسائٹی“ قائم کی تو ان کے سامنے ایشیا کے مسائل تھے، مسلمان چونکہ انگریزی تعلیم سے بدکتے تھے، اور انگریزی علوم کے سیکھنے پر کسی طرح راضی نہیں تھے۔ اس لیے سرسید نے سوچا کہ کچھ علمی اور تاریخی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائی جائیں، تاکہ مغربی علوم کی وقعت ان کے دل و دماغ میں پیدا ہو۔ سرسید مستقبل کے حالات اور اصول وضوابط کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اور یہ سب کچھ اسی کی تیاری تھی۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

”غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال و اسباب

کے ضائع ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بوڑھا کر دیا میرے بال سفید کر دیے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں، لیکن نہیں میں نے ہجرت کا ارادہ ترک کیا، اور قوم کی بھلائی کے لیے جدوجہد کی راہ اختیار کی۔'' (حیاتِ جاوید، ص 139.40)

جس شخص کے سوچنے کا انداز یہ ہو، جس کی نظروں میں اتنی گہرائی اور وسعت ہو، اس کے امور کا تجزیہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پورے ملک کو پستی، جہالت اور غفلت سے نکال کر اعلیٰ اور بلند مقام پر پہنچانے اور ہندوستانیوں میں اتحاد اور قوم پرستی کی راہیں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ وہ ترقی اور تبدیلی کے اثرات کی اہمیت سمجھتے تھے، اور ان اثرات کو ضروری خیال کرتے تھے۔

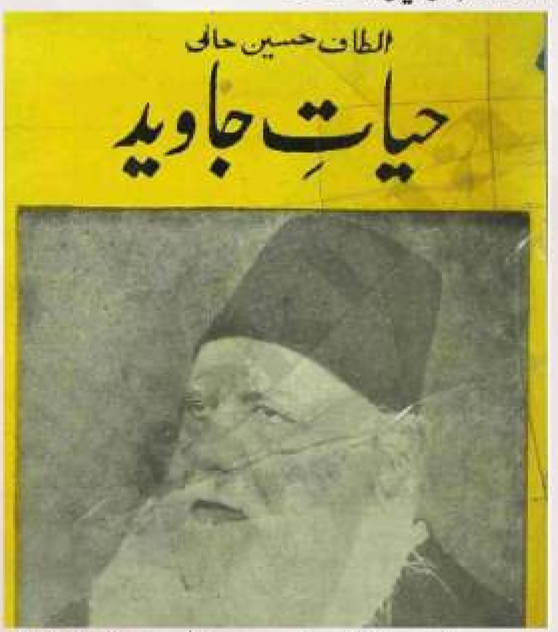

ان کی دور اندیش نظروں کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ قوم کی ترقی تبھی ممکن ہے جب وہ انگریزی علوم سے آراستہ ہوں گے۔ ان کا مقصد تھا کہ ہندوستانی مسلمان جدید تعلیمی نظام اور سائنسی علوم سے روشناس ہو جائیں۔ اس بات کی تکمیل کے لیے انھوں نے 1875 میں مدرسۃ العلوم کی سنگ بنیاد رکھی، جو عرصہ دراز کے بعد 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ ان کے اس عمل سے مشرق اور مغرب کے امتزاج سے ایک نیا معاشرہ ابھرنے لگا۔ قدیم اور جدید کے مابین تسلسل قائم ہوا۔

سرسید قومی تعلیم کا ایک ایسا نظام چاہتے تھے، جو ملک کے تمام افراد کی زندگیوں پر پوری طرح حاوی ہو۔ ان کے یہاں قومی تعلیم کا ایک واضح اور وسیع تصور ملتا ہے۔ قومی تعلیم کا جو مفہوم ان کے یہاں ملتا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید پورے ہندوستان میں جدید علوم کی تعلیم کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس لیے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم میں جب تک تعلیم کا اعلیٰ معیار قائم نہیں ہو جاتا، اور ایک بڑا حلقہ جب تک اعلیٰ تعلیم کا حامل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک اس کی ترقی ممکن نہیں۔

سرسید نے ادبی اور علمی دنیا میں بھی اپنی خدمات انجام دیں۔ ان کی تصانیف کو تاریخی ترتیب کی روشنی میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی تصنیفی خدمات ادبی دنیا میں ایک اضافہ ہے۔ سرسید کی نثر نگاری کی ابتداء ایک صحافی کی صورت میں ہوئی، جو انھوں نے 1837 میں اپنے برادران محترم کے اخبار ''سید الاخبار'' سے شروع کی۔ انھوں نے اپنے علمی اور ادبی ذوق کی بنیاد پر مختلف موضوعات کو قلم بند کیا۔ سیاست، تاریخ، ادب، صحافت، مذہب، سائنس جیسے موضوعات پر مضامین لکھ کر انھوں نے اپنی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ 1847 میں انھوں نے اردو میں ایک نئے موضوع پر اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ''آثار الصنادید'' تحریر کی۔ اس کتاب کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں دہلی کی عمارتوں کی تاریخ اور ان کی آرائشی تفصیلات کے علاوہ عمارتوں کے چربے موجود ہیں۔ یہ کتاب سید صاحب کی ہمت، محنت اور بصیرت کا نادر نمونہ ہے۔ گارساں دتاسی نے اس کتاب کو فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے 1860-61 میں شائع کیا۔ بجنور میں قیام کے دوران انھوں نے ''تاریخ ضلع سرکشی بجنور'' لکھی۔ اس میں مئی 1857 سے لے کر اپریل 1858 تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اسی دوران انھوں نے شہرۂ آفاق کتاب ''آئین اکبری'' کی تین جلدوں میں سے دو جلد یعنی پہلی اور تیسری کو تصویروں کے ساتھ ترتیب دے کر شائع کیا۔

سرسید کی متعدد تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں، ان میں ''اسباب بغاوت ہند'' جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ غدر کا ہنگامہ بہت سی غلط فہمیوں پر مبنی تھا جن کی ذمہ داری بڑی حد تک خود برطانوی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ ''جام جم''، ''فوائد الافکار''، ''کلمۃ الحق''، ''قول متین''، ''راہ سنت''، ''تبیین الکلام''، ''تزک جہانگیری''، ''مسافران لندن''، ''سیرت فریدیہ'' وغیرہ نے ان کی علمیت اور ذہانت کا لوہا منوایا۔ ''تفسیر قرآن'' لکھی، لیکن کسی وجہ سے اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ سر ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمد'' Life of mohammad جس میں اسلام کی حقانیت اور

پیغمبر صاحب کی شخصیت پر بے بنیاد اعتراضات کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے جواب میں انھوں نے ''خطبات احمدیہ'' لکھی۔ ''خطبات احمدیہ'' لکھ کر سرسید ان مسلم اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے، جنھوں نے انتہائی نازک وقت میں مسلمانوں کی دینی عزت اور آبرو کو بچایا۔ شب و روز کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل پر مبنی ایک رسالہ ''احکام طعام'' کو شائع کیا۔ انگلستان سے واپسی پر انھوں نے مسلمانوں کے بااثر طبقے کو متوجہ کرنے کے لیے لندن میں شائع ہونے والے ''ٹیٹلر'' اور ''اسپیکٹیٹر'' کی طرز پر 1870 میں ایک رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے نکالنا شروع کیا، اور اس میں اصلاحی اور مقصدیت سے بھرے ہوئے مضامین شائع ہونے لگے۔ ان مضامین کے ذریعے منفی اور مثبت دونوں پہلو سامنے آئے، اور یہ رسالہ مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے میں مکمل طور پر کامیاب رہا۔ سرسید کے فکر و عمل میں آفاقی عنصر صاف نظر آتا ہے، جس سے ان کے مقصد و منہاج کا پتا چلتا ہے۔ وہ اپنی ادبی، معاشرتی، سماجی اور اصلاحی فکر کے حوالے سے اہم شخصیت کے حامل تھے۔

ان کے مضامین میں کسی طرح کی غیر ضروری بات اور عبارت آرائی نہیں ہوتی۔ وہ تصنع اور بناوٹ کی شمولیت سے اپنی تحریروں کو پاک رکھتے تھے جس سے ان کی تحریروں میں سچائی اور خلوص جابجا نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں وہ روانی، شائستگی تسلسل اور بے ساختگی ہے، جو ان سے قبل کسی اور کے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔

سرسید کی تمام تحریروں میں ان کے اعلیٰ اسلوب کا حسن، نقطہ نظر اور ان کے علم و ادب کی عظمت اور موضوعات کا تنوع بہت متاثر کرتا ہے۔ اس حوالے سے حالی لکھتے ہیں:

> ''وہ ابتداء سے تحریر و تقریر میں تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے اور گریمر کی پابندی سے فطرۃً آزاد تھے .... وہ تحریر اور تقریر کی رو میں گریمر کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔ وہ ان قیدوں سے جو شاعروں اور منشیوں نے مقرر کی ہیں بالکل آزاد تھے۔ وہ ان لفظوں کو جو عام فہم اور عام و خاص کی زبان پر جاری ہوں، صحیح الفاظ پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی زبان دلی کی بول چال تک محدود نہ تھی، بلکہ جو جملہ بے اختیار قلم سے ٹپک گیا وہی ان کی زبان اور وہی بول چال تھی۔ غالباً انھوں نے کسی لفظ کے استعمال کرتے وقت یہ خیال نہ کیا ہوگا کہ قواعد کی رو سے اس کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں۔''

(حیات جاوید، ص 56-655)

الطاف حسین حالی نے اپنی اس تحریر کے ذریعے سرسید کی تحریروں کی ساری باتیں واضح کردی ہیں۔ جبکہ دیگر ناقدین نے سرسید کی تحریروں میں زبان و بیان کے اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ ان کا الزام ہے کہ سرسید ثقیل اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرتے ہیں، وہ قواعد اور محاوروں کی رعایت نہیں کرتے بلکہ ان کے یہاں فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔

سرسید نے اپنی تمام تحریروں میں تین چیزوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ مقصدیت، سادگی اور بے تکلفی۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے موضوعات اور خیالات کو دیکھتے ہوئے اسلوب کا استعمال کیا۔ وہ اپنے اسلوب کو ہر رنگ میں بڑی خوبی کے ساتھ ڈھال دیتے تھے۔ سرسید کو اردو ادب میں جو انفرادی حیثیت حاصل ہے اس کی سب سے بڑی وجہ بے ساختگی اور بے تکلفی ہے۔ وہ الفاظ کی تراش خراش اور مبالغہ آرائی سے بے حد پرہیز کرتے تھے اور سادہ اور عام فہم زبان کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

یہی انداز بیان ان کے خطوط میں بھی جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ پیرایہ اور القاب سے زیادہ انھیں مطلب کی فکر ہے، اسلوب سے زیادہ مضمون کی جستجو ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر خطوط مقصد سے بھرے اور کاروباری معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا ایک خط پیش نظر ہے:

> ''اس رات وہاں مسٹر پالک سے ملاقات ہوئی تھی، انھوں نے اپنا پتہ لکھ دیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا۔ وہ گھر پر نہیں تھے۔ ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ کرائے کی بگی میں کیا فرق پڑتا ہے؟ دس روپے روز۔ میں نے کہا، مرے۔''

(مکتوبات سرسید جلد اول، ص 421)

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید کے خطوط ان کی تمام زندگی اور ان کی قومی اور عملی جدوجہد کے بھی آئینہ دار ہیں۔ انسان کے عادات و اطوار، انداز طبیعت اور اس کے افکار و خیالات کا صحیح پتا صرف خط و کتابت سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ خطوں میں ان کی سیرت اور شخصیت کے بعض اہم پہلو اور خاندانی جھلکیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مراسلت اور خط و کتابت کا مقصد مکتوب الیہ کے حال احوال معلوم کرنا اور اپنے حالات سے واقف کرانا ہے۔ اپنے خطوں میں مکتوب نگار کو ایک عام انسان کی طرح زندگی کے بہاؤ میں بہتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ خطوط میں انسان اپنے جذبات و احساسات اور خیالات کھل کر بیان کرتا ہے۔

سرسید کے خطوط ان کی سوانح عمری کا دلچسپ اور مفید حصہ ہیں۔ یہ خطوط سرسید احمد خاں کے ذاتی سیرت اور کردار کے مطالعہ کا معتبر حوالہ بھی ہیں، سیاسی شکست اور سماجی تغیرات کے آئینہ دار بھی ہیں جن کی روشنی میں

سرسید سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں، اور ان کے خطوط کا ادبی مقام و مرتبہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ابتداء میں کہا جا چکا ہے ان کی سوانح سے زیادہ توجہ دوسرے مسائل پر مرکوز رہی ہے۔ ان کے سوانح نگاروں نے ان کی ذاتی زندگی کو کسی حد تک پیش تو ضرور کیا ہے، لیکن اس کی تفصیلات میں نہیں گئے ہیں۔ ان کے سوانح نگار مولانا الطاف حسین حالی اور امین بیری نے سرسید کے عادات و اخلاق پر تو لکھا ہے لیکن خاندانی رشتوں کی اہم تفصیلات کو سرے سے نظرانداز کر دیا ہے۔ سرسید نے بھی اپنی کوئی سوانح اور روزنامچہ مرتب نہیں کیا ہے، اور نہ ہی اس کی وضاحت کی ہے۔

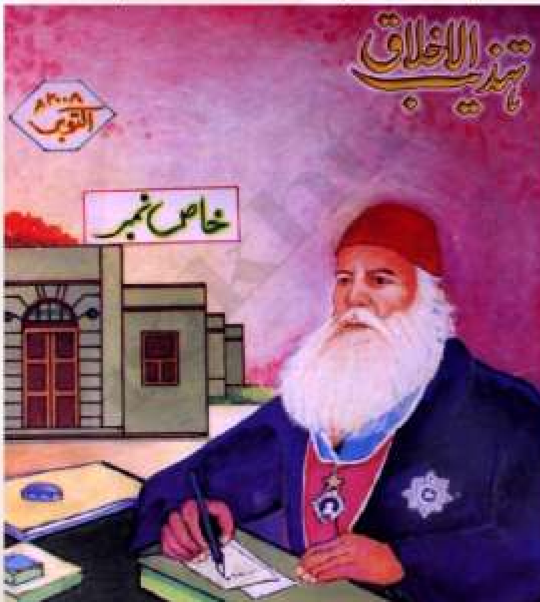

تعلیم نسواں کے متعلق بھی سرسید پر الزامات لگتے رہے ہیں کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے۔ وہ مردوں کی تعلیم کو تعلیم نسواں پر مقدم تصور کرتے تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم پر انھوں نے مطلق توجہ نہیں دی۔ دراصل سرسید باوجود مغربی علوم کے پرزور حامی ہونے کے مشرقی تہذیب کے بڑے دلدادہ تھے، کیونکہ ان کا خمیر مشرقی تہذیب کے عناصر سے تیار ہوا تھا، وہ مغربی تعلیم و تہذیب کے طفیل عورتوں کی بے جا آزادی اور بے حجابی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں مردوں کے مہذب ہوئے بغیر عورتوں کی تعلیم ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینے کے مترادف ہے۔ انھوں نے انھیں اسباب کی بنیاد پر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کوئی نئی تجویز پیش نہیں کی۔ تعلیم نسواں پر تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ بات بالکل غلط ہے کہ میں تعلیم نسواں کا مخالف ہوں۔ مجھ کو جہاں تک کلام ہے صرف تین امر میں ہے۔ ایک یہ کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ دوسرے یہ کہ انھیں کن علوم کی تعلیم دینا چاہئے، اور تیسرے یہ کہ ان کی تعلیم کا سب سے آسان طریقہ کیا ہوگا؟''

(مجموعہ لیکچرز و اسپیچیز، لیکچر 42، ص315)

سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا جو طریقہ اور نظام تعلیم ہمارے بزرگوں نے طے کیا تھا وہ آج بھی ان کے مطابق بالکل درست ہے، اور اس میں تبدیلی کی گنجائش بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ عورتوں کے لیے قدیم تعلیم ہی کو زیادہ مناسب تصور کرتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف نہیں تھے، لیکن انھیں عورتوں کے لیے مغربی تعلیم کی افادیت میں شکوک و شبہات تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنا ایک ذاتی نقطہ نظر رکھتے تھے۔

سرسید کی شخصیت کی عظمت اور ذہانت کا اندازہ لگانا نہایت ہی مشکل امر ہے۔ مشکل اور مایوس کن حالات میں خود اعتمادی اور جوش کے ساتھ انھوں نے کام کیا، اس کی مثال کم از کم مسلمانوں میں نہیں مل سکتی۔ جو اطوار و تجاویز تعلیم کے میدان میں انھوں نے اپنائے تھے، وہ ہمیشہ مشعل راہ کا کام دے سکتے ہیں اور آج بھی ہم ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ عملی اور محنتی انسان تھے اور یہی خوبی وہ ملک اور قوم کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔

سرسید احمد خاں صرف ایک سماجی مصلح شعبہ تعلیم کے انقلابی اور سیاست داں ہی نہیں تھے، بلکہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی معاشی فکر کی ترقی میں بھی کلیدی حیثیت کے حامل تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کی جو بنیادی وجوہات بیان کی تھیں، وہ بڑی حد تک پوری اسلامی دنیا پر صادق آتی ہیں۔ نیز اسلامی دنیا میں سرسید کے زمانہ تک کوئی دوسرا سرسید نہیں تھا، اور سرسید کے بعد بھی کوئی سرسید جیسا بے باک، صاف گو اور معاشرتی و معاشی مصلح پیدا نہیں ہوا۔

□□□

Khadija Khatoon
143-Shipra Hostel
Jawahar Lal Nehru University
New Delhi-110067

رفعت جمال

اہم یادیں

عصمت آپا کی کہانی ان کی زبانی

3 اپریل 1982 کی بات ہے۔ صبح سے بڑی گہما گہمی تھی۔ Introduction of second All India Conference on Status and Education of Women in India کا افتتاح دن کے تین بجے ہونا تھا۔ میں دوپہر کے کھانے کے بعد 'گرین روم' کی طرف بڑھ رہی تھی، کیونکہ کالج کی طرف سے ''سیتا بنواس'' ڈرامہ ہونے والا تھا۔ راستے میں ہوم سائنس سیکشن کے قریب چند خواتین نظر آئیں، جن میں لمبے قد کی ایک صاحبہ بھی تھیں۔ میں ایک نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گئی مگر اس چہرہ نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میرے ذہن کی پرواز کسی تصویر سے جا کر ٹکرائی تو میں چونک پڑی۔ ذرا غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو 'عصمت چغتائی صاحبہ' تھیں۔ میں واپس گیلری کی جانب گئی۔ وہ محترمہ کار میں دراز تھیں۔ آرام کی غرض سے گیسٹ ہاؤس جا رہی تھیں۔ اپنے ایک قریبی دوست سے معلوم ہوا کہ عصمت آپا ابھی کالج سے آ رہی ہیں۔ دل میں ملاقات کی تمنا لیے انھیں دیکھتی رہی۔

شام کا وقت تھا۔ ڈرامے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ آغا جمیل کاشمیری صاحب بھی تشریف لا چکے تھے۔ ان سے گفتگو کے درمیان عصمت آپا کا ذکر آ گیا۔ آپا سامنے صوفے پر بیٹھی نظر آئیں۔ جمیلہ آپا نے کہا ''جمیل صاحب آپ مل کر تعارف کرا دیں۔'' نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ ڈرامہ شروع ہونے میں کچھ تاخیر تھی۔ میری نماز مغرب قضا ہو رہی تھی لیکن جمیل صاحب نماز مغرب ادا کر رہے تھے۔ میں اور جمیلہ آپا ان کی نماز کی ادائیگی کا انتظار کرنے لگے۔ اس نماز کے بعد ہم لوگ اسٹیج سے نیچے اترے۔ پنڈال کافی بھر چکا تھا، جمیل صاحب نے ہم لوگوں کا رسمی تعارف کرایا۔ عصمت آپا جمیل صاحب سے یکبارگی بولیں ''آپ بنارس میں کیسے؟'' اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ سامنے میرے ہیڈ صاحب نظر آ گئے۔ میں نے ان کو سلام کیا پھر اسٹیج پر واپس آ گئی۔ ڈرامہ بہت خوب ہوا۔ آخر میں گروپنگ بھی ہوئی۔

4 اپریل 1982 اتوار کا خوشگوار دن تھا۔ مگر اس کانفرنس کا سیشن چل رہا تھا لہٰذا ہوسٹل سے کالج پہنچے اور گرین روم میں بیٹھ کر جمیلہ آپا سے باتیں کیں۔ پنڈال پر نظر پڑی وہ خالی تھا۔ شاید کانفرنس کا اجلاس یہاں نہ ہو کر کہیں اور ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مُکل بنرجی کھڑی ہیں۔ شاید سوچ رہی ہوں گی ہال تو خالی ہے میں کہاں آ گئی۔ میں انھیں مخصوص جگہ پر پہنچانے کے لیے بھاگ کر آئی۔ انھیں روم نمبر 1 تک لے گئی۔ چند لمحے بعد ہی عصمت آپا پر نظر پڑی۔ سفید ساڑی میں ملبوس آپا اندر بیٹھی تھیں۔ انھیں رجسٹریشن کے لیے باہر لایا گیا۔ میں نے سلام کیا پھر وہیں بیٹھ کر بات شروع ہو گئی۔ کچھ باتیں ان کی فلم 'جنون' کے بارے میں ہوئی تب انھوں نے بڑا ہی مزے دار قصہ سنایا۔

''ارے بھائی مجھے ایکٹنگ ویکٹنگ تھوڑی آتی ہے۔ وہ تو 'جنون' میں جو عورت کام کر رہی تھی اسے اچانک ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ پورا سیٹ تیار ہو گیا تھا۔ 'شیام بینیگل'' دوڑے دوڑے میرے پاس آئے۔ میں نے انکار کیا تو کہنے لگے کیا آپ ایکٹنگ کو برا سمجھتی ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ہر فن کو پسند کرتی ہوں۔ جب وہ زیادہ بضد ہوئے تو میں نے کہا کہ ''میں اپنی بیٹیوں سے پوچھ لوں۔ میرے گھر کی روایت ہے کہ میری بیٹیاں کبھی مجھ سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی ہیں۔ میں بھی بات کر لوں تب بتاؤں گی، بات ختم

ہوگئی۔ میری بیٹی آئی تو میں نے اس سے ذکر کیا۔ وہ تو ناچنے لگی۔ ''مما کام ضرور کرے گی۔'' بعد میں اس نے شیام بینیگل کو فون کیا۔ بس میں نے کام کر لیا۔ حالانکہ میرا کام صرف دو دن کا تھا مگر جب تک شوٹنگ ہوئی میں لکھنؤ میں رہی۔ چونکہ شوٹنگ جوش ملیح آبادی کے دادا کی حویلی میں ہو رہی تھی۔

اس کے بعد عورتوں کے حقوق اور فرائض کا ذکر چلا۔ عصمت آپا نے کہا عورت کسی سے کم نہیں ہے۔ عورت کو خود مضبوط ہونا چاہیے۔ میں نے ہمیشہ پیسہ کمایا۔ میرے شوہر سے اسی بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ میں ان کا اور اپنا حساب الگ الگ رکھتی تھی۔ یہ گفتگو چل رہی تھی کہ میٹنگ شروع ہو گئی۔ ہم سب لوگ کانفرنس ہال میں چلے گئے۔

میٹنگ کی کارروائی شروع ہوئی تو دوسری خواتین کی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ عصمت آپا درمیان میں اکثر ٹوکتی رہیں بولتی رہیں کیونکہ ان کو اس بات سے اتفاق نہیں تھا کہ عورتوں کے اسٹیٹس (Status) کے لیے یہ قانون بنے یا وہ قانون بنے لہٰذا درمیان میں وہ بولتی تو اکثر لوگوں کو ان سے اتفاق نہیں ہوتا اور ان کو ٹوک کر خاموش کر دیا جاتا۔

چند خواتین کی تقریر کے بعد ان کو باقاعدہ ڈائس پر بلایا گیا۔ بڑی زبردست تقریر کی اور کہا ''یہ مانگنا وانگنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ عورت مرد سے کم کہاں ہے۔ عورت کو دینا سیکھنا چاہیے۔ آپ جتنا دیں گی آپ کو ملے گا۔ جب آپ کو دینا آجائے گا تو یہ سوال ہی ختم ہو جائے گا کہ ہمیں یہ ملے وہ ملے۔''

5اپریل 1982 کو کانفرنس کا دوسرا دن تھا۔ جوں ہی میں پہنچی آپا اسٹاف روم کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ میں نے جا کر سلام کیا اور اس کے بعد وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت میں نے ان سے ان کے خاندان کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ انھوں نے اپنے والد کا نام 'صفت بیگ' اور ماں کا نام 'نصرت بیگم' بتایا۔ پھر اپنی ماں کے قصے سنانے لگیں۔ ان کی والدہ نہایت شریف اور نیک خاتون تھیں، بڑوں کا ادب کرتی تھیں، بے پناہ محبت کرنے والی تھیں اور اپنے وطن کی مٹی سے انھیں عشق تھا۔ عصمت آپا نے بتایا کہ وہ دس بھائی بہن تھے۔ سب سے چھوٹی وہ ہیں۔ پھر اپنی والدہ کا وہ قصہ سنایا جب وہ پاکستان نہیں گئی تھیں اور ان کے دو ماموں اور بھائی جودھپور میں انھیں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ چار ماہ کے بعد ان کے بھائی نے کراچی سے لکھا کہ وہ لوگ وہاں پہنچ گئے ہیں اور اماں نہیں آئی ہیں۔ یہ سن کر مجھے بہت بے چینی ہوئی۔ میں فوراً جودھپور پہنچی۔ میری ماں نے پہلی بار مجھے ''میری بچی کہہ کر گلے لگا لیا۔'' چونکہ بچپن میں میں بہت شریر تھی۔ اماں نے ہمیشہ مارا اور ڈانٹا تھا۔ لیکن اس دن پہلی بار ان کے پیار نے مجھے ایسی چوٹ لگائی کہ اگر وہ مجھے پتھر اٹھا کر مار دیتی تو اتنی چوٹ نہیں لگتی۔ اس قصے کو انھوں نے قیام کے دوران کئی مرتبہ سنایا۔ ہر بار ان کی آواز رندھ جاتی اور آنکھیں بھی پرنم ہو جاتیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ''گرم ہوا'' میں انھوں نے اپنی والدہ کا قصہ تحریر کیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ فسادات شروع ہو گئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ہمارے گھر کے قریب اسکول کے لڑکوں کو مارا پیٹا گیا تھا۔ واقعہ زیادہ سنگین نہ تھا لیکن ادھر ادھر کی خبروں سے سبھی لوگ خوف زدہ تھے لہٰذا میرے بھائیوں نے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ ایک سندھی کو گھر کرایہ پر دے دیا۔ اماں برابر منع کرتی رہی لیکن یہ لوگ انتظامات کرتے رہے۔ جب جانے کا دن آیا تمام دوست واحباب اکٹھا ہوئے۔ موٹر کاریں آ کر لگ گئیں۔ سامان لاد دیا گیا۔ ماں سے چلنے کو کہا وہ بولیں ''میں نہیں جاؤں گی۔ کیسے جاؤں میری جڑیں تو یہاں ہیں۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' جب ان کی کسی نے نہیں سنی تو وہ لکڑیوں کی کوٹھری میں جا کر بیٹھ گئیں اور اندر سے کنڈی بند کر لیں۔ بہت کہا گیا لیکن وہ نہ نکلیں۔ دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا تو پھر ترک کر دیا۔ چونکہ اتنے موٹے کواڑ توڑنا دشوار تھا آخر کار مجبور ہو کر لوگوں نے ان کا بکس اتارا اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اماں باہر آ گئیں۔ رات کو جب روشنی ہوئی لوگوں نے سوچا غلطی سے بجلی جلتی چھوڑ گئے ہیں۔ صبح جب لائٹ بند ہو گئی تو سامنے والے گھر کے لوگوں نے آ کر دیکھا میری ماں تنہا بیٹھی تھیں۔ وہ لوگ انھیں لے گئے۔ وہ سامنے سے اپنے گھر کو دیکھتی تھیں اور جب کوئی چیز توڑی جاتی تھی تو تڑپ اٹھتی تھیں اور کوئی پیڑ کاٹا جاتا تو افسردہ ہو جاتیں۔ ہائے ان کے ہاتھ کی لگی بیل بھی کاٹ دی۔ اس کے بعد میں انھیں وہاں سے لے آئی۔ وہ بہت دکھی رہتی تھیں۔ 1975 میں ان کا انتقال ہو گیا۔

لنچ کے بعد میں گئی تو پتہ چلا عصمت آپا دھوپ کی وجہ سے گئی نہیں بلکہ اوشا جی کے کمرے میں ہیں۔ ان کی باتوں میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہاں کا منظر نامہ یہ تھا کہ ایکونومکس کے تعلق سے باتیں ہو رہی تھی وہ ایکونومکس کی لیکچرر تھیں میں نے دوران گفتگو 'جوش' کا ذکر چھیڑ دیا، بولیں بڑے حسن پرست تھے۔ میں اپنی نواسی کے ساتھ ان سے ملنے گئی چھوٹی بچی تھی مگر ان کی نظریں اس پر جم گئی۔ میں نے ٹوکا تو خوب ہنسے، بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ تقریباً 4:30 بجے کلچرل پروگرام میں کالج چلے گئے، چائے پی کر پھر گرین روم میں بیٹھ گئے جہاں ''ایک اور دروڑاچاریہ'' کا میک اپ چل رہا تھا وہاں بھی عصمت آپا بولتی رہیں اور ہم لوگ ان کی باتوں سے محظوظ ہوتے رہے پھر انھوں نے فریش ہونے کے لیے منہ دھویا، مجھے بہت دعائیں دیں۔ ''جیتی رہو تم نے میرا بہت کام کیا۔''

6اپریل 1982 آج صبح ناشتے پر میری ڈیوٹی تھی ہم لوگ گیسٹ

ہاؤس پہنچے آپا تیار ہو رہی تھیں۔ دوسرے مہمانوں سے مل کر میں ان کے کمرے میں گئی، وہ تیار کھڑی تھیں، میں نے ان کی ساڑی تہہ کی، ان کی اٹیچی ٹھیک کی، انھیں اس کے بعد ڈاکٹر قمر جہاں کے گھر جانا تھا۔ ہم لوگ ٹہلتے ہوئے دوسرے گیسٹ ہاؤس آئے جہاں تقریباً دو گھنٹے، ناشتے کے ساتھ ساتھ باتوں کا دور چلتا رہا۔ کالج آئے، کانفرنس ہال میں آپا سے پھر بولنے کو کہا گیا۔ وہ خاص طور سے اردو میں بولیں، بہت زبردست تقریر کی لوگوں نے خوب تالیاں بجا کر ان کی باتوں کی داد دی۔ خاص طور سے انھوں نے نوجوان ٹیچرس اور ان کے علم کی بڑی تعریف کرتے ہوئے کہا ''ان روشن چہروں کو لے جاؤ اور پورے ہندوستان کو روشن کرو۔''

لنچ کے بعد ڈاکٹر جمیلہ آپا کے گھر گئے وہاں وہ اپنی زندگی کے مختلف تجربات بتاتی رہیں ان کا کہنا تھا کہ ''دنیا کو محبت سے فتح کرو'' اس کے بعد ان لوگوں کو سارناتھ جانا تھا، ہم لوگوں کا بھی پروگرام تھا لیکن عین موقع پر 'بس' نہیں گئی۔ وہ لوگ کار سے چلے گئے۔ اس کا ہم لوگوں کو بہت افسوس رہا۔ عصمت آپا بھی چاہتی تھیں کہ ہم لوگ چلیں۔ مگر افسوس سارناتھ کے ان کے جذبات کو میں نہیں جان سکی وہاں انھوں نے کیسا محسوس کیا۔ ہر چیز کو دیکھ کر بڑی بے تکلفی سے بولتی تھیں، خیر شام کے وقت میں، سریتا، قمر آپا کے گھر چلی گئیں۔ وہاں عصمت آپا رہنے والی تھیں ان کی باتوں سے میرا دل ابھی تک بھرا نہیں تھا تقریباً 8 بجے آپا آئیں۔ رات کا کھانا کھایا پھر باتوں کا دور چلا۔ آپا کافی موڈ میں جذباتی باتیں کر رہی تھیں۔ اس وقت انھوں نے اپنی شادی کا قصہ چھیڑ دیا'' میں ابتدا ہی سے باغی تھی، ابھی میٹرک کا امتحان دینے جا رہی تھی، ایک دن میں نے سنا، کوئی زبردست رشتہ ہے، لڑکا ڈپٹی کلکٹر ہے اور اماں میری شادی کرنے پر آمادہ ہیں، مجھے دھن کہ پڑھنا ہے، اب شادی کیسے روکی جائے۔ کافی سوچ وچار کے بعد پلان بنایا۔ میرے ماموں کا ایک لڑکا تھا اس وقت ایم بی بی ایس کر رہا تھا مجھے بہت پیارا تھا میں نے اس کو لکھا، میری شادی کا معاملہ ہے اس شادی کو تم روک سکتے ہو اور میں تم کو بتاتی ہوں کہ تم میرے ساتویں لاڈلے بھائی ہو، میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔'' بہر حال اس نے اپنے والد کو لکھا، پھر وہ میرے گھر آئے اماں کے بھائی کا بیٹا تھا، اپنا خون تھا، پسند آیا اور انھوں نے ڈپٹی کلکٹر کا رشتہ واپس کر دیا اس طرح اس وقت شادی ٹل گئی اور انھوں نے مزید پڑھائی کے لیے گھر والوں کو آمادہ کر لیا۔ یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے اماں آگے پڑھانے پر راضی نہیں تھی۔ میں نے اپنی بات منوانے کے لیے کھانا بند کر دیا جب دو وقت کا فاقہ ہو گیا تو والد صاحب نے پوچھا'' گاندھی جی کا کیا حال ہے'' مجھے بلایا گیا۔ پیشی پڑی انھوں نے مجھ سے کہا کیا طے کیا۔'' میں نے کہا، میں تو پڑھوں گی، اگر نہیں پڑھایا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی'' وہ مسکرائے کہنے لگے، کیسے بھاگو گی؟'' میں نے کہا رات کو 2 بجے دروازہ کھول کر نکل جاؤں گی پھر تانگہ لے کر اسٹیشن چلی جاؤں گی، وہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر اگلے اسٹیشن اتر جاؤں گی چرچ جا کر عیسائی بن جاؤں گی اور بس پڑھوں گی۔'' (اس وقت عیسائی مذہب قبول کرنے والے کی پوری سرپرستی کی جاتی تھی) والد صاحب خوب ہنسے، یہاں تو مارواڑی لوگ رہتے ہیں، وہ تمھاری بات سمجھیں گے کیسے۔ اتنی رات میں تانگہ کب ملے گا، آخر کار فیصلہ ہوا ابھی لڑکے کو ایم بی بی ایس کا کورس پورا کرنے میں تین چار سال لگیں گے اس لیے لڑکی کو پڑھنے دیا جائے۔ اس طرح پڑھائی آگے جاری رہی اور میں نے بی اے کر لیا۔ اس سلسلے کا ایک اور قصہ سنایا۔

ان کے بڑے بھائی 'عظیم بیگ چغتائی' ٹی بی کے مریض تھے، بھابھی ان کو سینٹوریم بھوالی لے گئیں، بچوں کے ساتھ میں رہتی تھی، ایک دن پتہ چلا کہ کسی نواب سے میری اور ان کے بھتیجے یا چھوٹے بھائی سے میری بھتیجی کی شادی طے کی جا رہی ہے، میں نے کہا اتنی چھوٹی بچی اور شادی اور میری بھی؟ بس میں نے پلان کیا، بڑی بچی کو لے کر بریلی آ گئی تھی، دو چھوٹے بچوں کو وہیں چھوڑ دیا، والدہ کو جب پتہ چلا وہ جا کر بچوں کو لے آئیں، اس بیچ نوکران کا سب سامان لے کر جا چکا تھا، ماں بہت ناراض ہوئیں، ایک شادی کے موقع پر والدہ صاحبہ بریلی آئیں، مجھ سے کچھ نہ بولیں بہت غصہ تھیں۔''

بریلی میں اسلامیہ گرلس انٹر کالج میں پرنسپل کے عہدہ پر ان کی تقرری ہوئی، مگر ان کی شوخ اور چنچل طبیعت نے ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ اپنے عہدہ کے مقام کو بھی بھول جاتیں اور کیری کھانے کے لیے آم کے پیڑ پر چڑھ جاتیں۔ ایک بار وہ پیڑ کی ڈال پر بیٹھی ہوئی تھیں کہ انسپکٹر آف اسکول معائنہ کرنے آ گئے، لڑکیوں سے میرے بارے میں معلوم کیا ''پرنسپل کہاں ہیں؟'' میں نے کہا یہاں ڈال پر، وہ دیکھتے رہ گئے پھر بریلی سے ممبئی چلی گئیں، وہاں دوسرے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں، اب وہ خود انسپکٹر آف اسکول بن چکی تھیں، بھائی ان کو بہت تنگ کرتے تھے، نوکری کرنے سے بھی منع کرتے تھے۔ یہاں پھر شادی کا سوال اٹھا اب میرے ماموں کے بیٹے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ سب کا سوال ہے کہ اب شادی کر دی جائے، عصمت آپا کو لڑکے سے بات کرنے پر مجبور کیا گیا، آج شام کو سمندر پر ملیں گے، میں تیار ہو گئی۔ سمندر کے کنارے ہم دونوں کھڑے تھے۔ میرے بھائی بولے مجھ سے کہا گیا ہے اس لیے میں تجھ سے بات کر رہا

ہوں، میں نے کہہ دیا اگر عصمت راضی ہوگئی تو شادی ہوگی، میں نے بے اختیار کہا،'' شادی وادی تو میں کروں گی......مگر تم سے نہیں......تم میرے بہت پیارے بھائی ہو۔'' اس طرح ڈاکٹر سے شادی کا مسئلہ ختم ہوا۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید گفتگو کی اور کہا۔

'' کچھ دنوں کے بعد بھائی سے میری اَن بَن ہوگئی تھی۔ شاہد لطیف سے میری دوستی تھی، شادی کی بات بھی چل چکی تھی لیکن شادی کا فیصلہ ابھی کیا نہیں تھا۔ گھر کے حالات سے پریشان ہو کر میں نے الگ رہنے کا فیصلہ کیا، اب مشکل یہ تھی کہ کوئی کرائے پر گھر دینے کو تیار نہیں۔ میں نے شاہد سے کہا گھر تلاش کرو، مجھے شادی کرنی ہے، تم کرو تو ٹھیک ہے ورنہ میں کسی اور سے بھی کروں گی۔ گھر والے راضی نہیں تھے کیونکہ مجھ کو350 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور شاہد کو175 روپے، وہ لوگ میری شادی کسی دولت مند سے کرنا چاہتے تھے، مگر میں نے کسی کی نہ سنی اور شاہد لطیف سے شادی کرلی۔ اس کے دو ماہ بعد شاہد کو2000 روپے ملنے لگے، پھر تو آمدنی خوب بڑھ گئی۔ اس کے بعد میری کہانی 'ضدی' پر فلم بنی اور مجھے3000 روپے ملے، اب تو ہم بڑے آدمی ہوگئے پھر تو پیسے کی کچھ کمی نہ رہی۔ شاہد مجھے میٹر لاکے دیتے اور میں کہانی لکھتی، لکھنے کا ذوق اس وقت اتنا بڑھا ہوا تھا کہ 8 بجے صبح لکھنے بیٹھتی اور 11 بجے تک شاہد کے آنے سے پہلے کہانی مکمل کرلیتی تھی۔

شاہد پہلا مرد تھا جو جسمانی طور پر میرے قریب آیا۔ میں تو اس کے پیچھے پاگل ہوگئی، میری اس دیوانگی کو شاید شاہد نہیں سمجھ پایا۔ میں جس نے کسی کے لیے کبھی کچھ نہیں کیا شاہد کے لیے سوئٹر بنتی، کرتے کاڑھتی، لیکن ایک دن میرے ان جذبات کو دھکا لگا، جب شاہد نے وہ کرتا جو میں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا ایک دوست کو دے دیا۔ اس بات نے ایسا دل پر اثر کیا اور مجھے نہ معلوم کیا ہوگیا کہ میں پتھر ہوگئی، ہماری زندگی میں ایک خلاء بن گیا، ہم لوگ ساتھ رہتے اور کام کرتے رہے مگر بہت قریب نہ آسکے۔ شاہد بہت پینے لگا آخر کار ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔ میری اب تک سمجھ میں نہیں آیا ایسا کیوں ہوا؟ اس قصے کو سناتے سناتے وہ سرد آہیں بھرنے لگیں، شاید وہ اپنے ماضی میں کھوگئی تھیں، ان کے مطمئن چہرے پر تھوڑی سی پریشانی دیکھی تب میں نے اور سوال نہیں کیا کہ ان کو دکھ ہوگا۔ کافی رات تک باتیں ہوتی رہیں، یک بارگی میرے منہ سے نکل گیا آپ تو اتنی بہادر ہیں آپ نے شادی کیوں کی، وہ بولی میں اس وقت اتنا پریشان تھی کہ کسی سے بھی شادی کرلیتی، ہاں اگر بعد میں کرتی تو ذرا سوچ سمجھ کر کرتی۔

ادب کی بات چھڑ گئی، اردو افسانے کی بات چلی تو آپ نے کرشن چندر اور منٹو کے ساتھ گزرے لمحات کا بڑے چٹخارے لے لے کر تذکرہ کیا۔ کہنے لگیں '' کرشن چندر، بہت معصوم اور صاف دل کے انسان تھے۔ جو لکھتے اس کی تہہ تک جاتے۔ جب وہ بمبئی کے فٹ پاتھ پر رہنے والوں کی زندگی کو اپنے افسانوں میں اتار رہے ہوتے تو خود ان کے درمیان جا کر سوتے، ان کی گفتگو سنتے، ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرتے، ان کی زبان کو اپنے افسانوں میں سمو دیتے تھے۔ صبح اٹھ کر میرے گھر آتے تو میں کہتی بھاگو تمھارے کپڑوں سے گندے لوگوں کی بو آتی ہے اور وہ ہنس دیتے۔''

اس طرح منٹو کے بارے میں بتایا۔ ہم دونوں پر مقدمہ چلا، لاہور میں پیشی ہوتی، دونوں ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ میں اس سے کہتی تھی کیا تم طوائف کے پاس جاتے ہو جو اتنی باریکی سے ان کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہو، وہ چڑ جاتا۔ ہم لوگوں کے درمیان بہت نوک جھونک ہوتی۔ میری بیٹی چھوٹی تھی وہ بھی ساتھ رہتی اس کے دودھ کی بوتل میں تیار کرتی تو منٹو کہتا...... آپ یہ کام بھی کرلیتی ہیں اس نوک جھونک میں سفر بہت سہانا ہوتا، حالانکہ ذہنی دباؤ رہتا۔

1942 کی 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کے سلسلے میں 'آزاد میدان' میں ایک جلسہ تھا۔ جس کی انگریزوں نے مخالفت کی اور لاٹھیاں برسانی شروع کردی، جس سے لوگ منتشر ہوگئے اور کچھ نوجوان عصمت آپا کے گھر آگئے۔ انھوں نے ان کو غسل خانہ میں بند کردیا۔ اس بیچ پولیس ہندوستانیوں کی تلاش میں ان کے گھر میں داخل ہوگئی اور پورا گھر چھان مارا، کوئی نہیں ملا۔ وہ باتھ روم کی طرف آئے اور اسے کھولنے کو کہا، تو میں نے کہا میری ساس نہارہی ہیں۔ وہ لوگ واپس چلے گئے اور نوجوان ان کے غضب سے محفوظ رہے۔

7اپریل1982 آج سویرے جلدی سے اٹھی، عصمت آپا کے ساتھ اسی گھاٹ پر Sun Rise دیکھنا تھا۔

گھاٹ کا منظر بہت سہانا تھا۔ عورت مرد اور بچے سب نہار رہے تھے۔ سورج بادلوں کی گردش سے خود کو آزاد کرنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ ہم لوگ کشتی کے لیے ملاح تلاش کررہے تھے، عصمت آپا کو لوگ ودیشی سمجھ رہے تھے، خوب پریشانی کے بعد منزل ملی، لیکن وقت اچھا گزرا۔ سورج دیوتا کے درشن کا منظر بڑا سہانا تھا۔ کتنی خوبصورت صبح تھی۔ لوگ سورج دیوتا کو جل چڑھا رہے تھے۔ نہاتی ہوئی دوشیزہ بڑی پیاری لگ رہی تھی، آپا ان کے حسن کی تعریف میں مگن تھیں۔ کہتیں 'ان کے بالوں سے گرتی پانی کی بوندیں موتی جیسی نظر آرہی ہیں' سورج نکل رہا تھا میں اور سریتا، عصمت آپا کے ساتھ ناؤ میں بیٹھے اور ان کی باتوں میں کھوگئے۔ پانی

اور سورج کی کرنوں سے لطف اندوز ہوتے رہے، لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ گنگا کی لہروں کے ساتھ کھیلتے رہے، آپا گھاٹ کے بارے میں معلوم کرتی تھیں، وہ سب کچھ ان کو بہت خوشی دے رہا تھا۔

آج عصمت آپا بہت موڈ میں تھیں کہنے لگیں 'میں سبزی بناؤں گی' میرا جب دل چاہتا ہے کچن میں چلی جاتی ہوں، پھر سامنے جو رہتا ہے ڈال کر پکا لیتی ہوں۔ ہم لوگوں نے مل کر سبزی پکائی۔ آپا نے انڈا پالک اور کریلے کی سبزی پکائی۔ دونوں سبزیاں بے حد مزے کی تھیں۔ اتنے عرصے میں A.I.R والے آ گئے انھوں نے عصمت آپا کا انٹرویو لیا، باتیں رکارڈ کیں۔

چار بجے شام کو اردو ڈپارٹمنٹ میں پروگرام تھا، میں آپا کے ساتھ ڈپارٹمنٹ گئی۔ وہاں سب ٹیچرس اور بچے ان کا انتظار کر رہے تھے، آپا کو میں ہیڈ صاحب کے کمرے میں لے گئیں، وہاں سب ٹیچرس کا تعارف کرایا گیا۔ اتفاق سے میرا نام آیا کوئی دوسری بات چھڑ گئی، میری پہچان نہ ہو سکی۔ آپا مجھے ریسرچ اسکالر سمجھتی تھیں، کچھ دیر اس کمرے میں بیٹھے رہے، بچے بے چین تھے کہ کب آپا بولیں اور وہ سنیں، پھر آپا کو لیکچر روم میں لے گئے۔ عصمت آپا اردو کو (ناگری لیپی) میں لکھنے کی وکالت کرتی رہیں، اس پر بہت بحث ہوئی۔ ایک ٹیچر نے سوال کیا آپا لوگ کہتے ہیں 'ٹیڑھی لکیر' آپ کی اپنی زندگی ہے۔ بولی نہیں کئی کیریکٹر کی زندگی کے واقعات میں نے 'شمن' کے کیریکٹر میں سمو دیے ہیں، کچھ حالات میرے ہیں، کچھ دوسرے لوگوں کے ہیں، ہاں یہ حقیقت ہے کہ سب واقعات سچے ہیں، کچھ مجھ پر گزرے ہیں کچھ دوسروں پر۔ اسی طرح لوگ ان سے سوالات کرتے رہے اور وہ خوش اسلوبی سے جواب دیتی رہیں۔ شور مچا چلیے چلیے، نیچے وی۔ سی صاحب آ گئے ہیں، بات حقیقت میں گروپ فوٹو لینے کی تھی، لوگ ناشتہ کیے بغیر نیچے اتر آئے۔

وی۔ سی صاحب ایک گھنٹہ لیٹ آئے تھے سب لوگ گرمی میں کھڑے کھڑے پریشان ہو رہے تھے، آپا کو گرمی بہت لگتی تھی۔ ایک کمرہ تلاش کیا گیا۔ آغا جمیل کشمیری کے ہمراہ آپا اور دوسری خواتین بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں، لمبے انتظار کے بعد وی۔ سی صاحب آئے تو میں نے آپا سے کہا جلدی چلیے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آپا وہاں پہنچ گئیں جہاں وی۔ سی صاحب بیٹھے تھے، فوٹو گرافی کے بعد سب لوگ 'آرٹس آڈیٹوریم' میں آ گئے، یہاں آپا کا پروگرام تھا انھوں نے اپنی پندرہ سال پرانی کہانی ''پتھر دل'' سنائی، پھر لڑکوں نے کچھ سوالات لکھ کر دیے جن کا انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا، یہ سلسلہ 7:30 بجے تک چلتا رہا، بڑی مشکل سے ہیڈ صاحب نے لڑکوں سے اجازت لی، اگر وہ جلدی نہ کرتے تو شاید ساری رات یونہی باتوں، ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہتا، اس کے بعد پھر اوپر اردو ڈپارٹمنٹ جانے کو کہا گیا، عصمت آپا سیڑھی چڑھنے سے گھبراتی تھیں۔ انھیں سخت گرمی لگ رہی تھی۔ وہ اوپر نہیں گئیں اور مجھے بھی ان کے ساتھ قمر آپا کے گھر آنا پڑا، تھوڑی دیر بعد قمر آپا بھی آ گئیں، کھانا کھایا، کافی رات تک محفل جمی پھر سو گئے۔

8 اپریل 1982 آج کا پروگرام راج گھاٹ ڈگری کالج میں تقریر کا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ راج گھاٹ گئی۔ اس سے پہلے میں نے بھی کالج گھوما نہیں تھا۔ ان کی تقریر کا جہاں انتظام تھا وہ مقام بڑا ہی دلکش تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے لڑکیاں اور ٹیچرس محوِ انتظار تھیں۔ دائیں جانب گنگا بہہ رہی تھی۔ آپ کو یہاں خاص طور سے اس لیے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ بتائیں ایک فن کار کو کن چیزوں سے لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔

عصمت آپا نے اپنے بچپن کی ایک کہانی سنائی جو ان کی دادی سناتی تھیں کہ گنگا جمنا کیسے بنیں اور کس طرح ان کا سنگم ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تقریباً بارہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ میں ان باتوں کو لکھتی تھی جن کو کہہ نہیں سکتی تھی۔ ان دنوں سخت پردہ تھا۔ گھر میں نوکر اور ڈاکٹر کے علاوہ کوئی نہیں آتا تھا۔ میرے ایک فیملی ڈاکٹر تھے جو کافی بوڑھے ہو چکے تھے اور میں تو کبھی بیمار بھی نہیں پڑتی تھی کہ ڈاکٹر سے بات ہو۔ دل میں بڑی چاہت تھی۔ میں نے اپنے اوپر ہی ایک کہانی لکھی۔ میرا ہیرو ایک بہت خوبصورت ڈاکٹر ہوتا ہے۔ میں سخت بیمار ہوتی ہوں وہ دیکھنے آتا ہے اور دیکھتے ہی عاشق ہو جاتا ہے۔ اب عاشق کرتے کیا ہیں یہ تو مجھے معلوم نہ تھا۔ قصے کہانیاں سنتی یا پڑھتی کہ ہیرو مر گیا۔ ہیروئن مر گئی لہٰذا میری کہانی کا انجام بھی یہ ہوتا ہے کہ ہیروئن کو بہت تیز بخار آتا ہے اور وہ مر جاتی ہے۔ بعد میں ہیرو بھی خودکشی کر لیتا ہے۔

انھوں نے بچیوں کو بتایا کہ زندگی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ تم سب لکھ سکتی ہو۔ لکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ڈائری لکھا کرو۔ روز کے واقعات لکھنے سے عبارت میں روانی آتی ہے۔ لکھنا بہت اچھی چیز ہے۔ سب لکھو۔ جب انھوں نے اپنی دلچسپ باتوں سے لوگوں کو محظوظ کرنا شروع کیا تو لوگ بھول ہی گئے کہ دھوپ آ گئی ہے۔ پھر ہم لوگ ان کو اسٹاف روم میں لے آئے۔ چائے کا دور چلا۔ چند لمحات کے بعد چائے کا دور گزرا۔ کالج کا کیمپس گھوما پھر گھر آنے کی تیاری ہوئی۔ راج گھاٹ کی پرنسپل نے اپنی گاڑی سے گھر بھجوایا۔ میں ہوسٹل میں رک گئی۔ آپا گاڑی سے قمر آپا کے گھر چلی گئیں۔

دوپہر میں میں بھی قمر آپا کے گھر واپس چلی گئی۔ دیکھا آپا اور ہوش

صاحب محوِ گفتگو ہیں۔ قمر آپا ڈپارٹمنٹ گئیں ہیں ایک طالبہ بیٹھی ہے۔ تین بج گئے۔ پتہ چلا کہ آپا نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ میں نے کچے آم کی چٹنی تیار کی اور آلو کے پراٹھے بنانے لگی۔ ابھی دو چار پراٹھے ہی بنائے تھے کہ قمر آپا آ گئیں۔ انھوں نے آپا اور ہوش صاحب کو کھانا کھلایا۔ اس کے بعد چائے اور گفتگو کا دور چلتا رہا۔ قمر آپا نے چند تصویریں لیں۔ رات کو آپا کو سکینہ صاحب کے گھر ڈنر پر جانا تھا۔ میں سریتا کے گھر چلی گئی۔

9 اپریل 1982 جب آپا انھیں کہنے لگیں کہاں چلی گئی تھی۔ اچھا نہیں لگتا تھا۔ پانچ بجے لیڈی کلب جانا تھا۔ ڈاکٹر ناظم صاحب آئے، بیٹھے رہے۔ آپا اب اٹھتی تھیں نا تب! وہ لوگ محوِ انتظار ہی رہے کہ آپا اٹھ کر تیار ہوئیں اور پھر چند باتیں کیں۔ مجھے تیار ہو کر ان کے ساتھ جانا پڑا۔ ہم لوگ لیڈی کلب پہنچ گئے۔ یہاں کی بات چیت بہت دلچسپ نہ رہی کیونکہ سیاسی موضوع پر بحث چھڑ گئی۔ بہت مزہ نہ آیا۔ چائے کے بعد لوگ یونیورسٹی مندر گئے۔ آپا نے ایک ایک چیز کو غور سے پڑھا۔ ہر مورتی کے آگے جیسے دوسرے لوگ کچھ کچھ منتر پڑھتے وہ بھی پڑھنے لگیں اور چپکے چپکے مجھ سے کہتی تم بھی پڑھو۔ میں نے یہاں آیت الکرسی پڑھی، یہاں الحمد اللہ مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر ہم لوگ گھر واپس آ گئے۔ دس بج رہے تھے۔ کھانے کا مسئلہ در پیش آیا۔ آپا بولیں میں پراٹھے بناؤں گی۔ انھوں نے بہت اچھے پرت دار پراٹھے بنائیں۔ دوسرے دن وشوناتھ گلی ساڑیاں دیکھنے کا پروگرام تھا۔ اس لیے 12 بجے کے قریب سو گئے۔

10 اپریل 1982، 9 بجے تک ناشتہ کر کے ہم لوگ چائے کے لیے تیار ہو گئے۔ سریتا جی کا انتظار تھا۔ اتنے میں نجم الدین صاحب آ گئے۔ آپا ساڑی بننے والوں کے گھر اور وہ 'ہتھ کرگھ' دیکھنا چاہتی تھیں جن ہاتھوں سے ساڑی کا فن ابھرتا ہے۔ آج گاڑی کا انتظام نہیں تھا۔ ہم لوگوں کا رکشا اور ٹیمپوں سے جانے کا پروگرام تھا۔ لہٰذا نجم الدین صاحب کے ساتھ چلے۔ میں نے کہا رکشا لے لوں تو آپا نے اترنے ہی نہیں دیا کہ سریتا ساڑھے نو بجے تک گھر کیوں نہیں آئی۔ بہر حال آپا کو لنکا پہنچنا دشوار ہو گیا۔ میرے خیال سے رکشا میں انھیں الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ راستے میں نجم الدین صاحب کو نہیں دیکھنے دیا۔ سیدھے کھنیجا کے یہاں چشمے کے لیے گئیں۔ اس دکان کا چشمہ انھیں بے حد پسند آیا۔ پھر نجم الدین صاحب کے ساتھ پیلی کوٹھی گئیں۔ وہاں ساڑی بنانے کے کارخانے دیکھے۔ گھر میں جا کر عورتوں کو ریشم کی ریل بناتے دیکھا۔ پھر نجم الدین اپنے گھر لے گئے۔ جوں ہی ان کے گھر میں داخل ہوئے ان کی بیوی آئیں اور بولیں ''خدا حافظ''۔ دو سکنڈ کے لیے میں بھی چونکی۔ آپا تو سنبھل کر بیٹھ گئیں اور مزیدار باتیں کرنے لگیں۔ بارہ بجے میں نے کہا اب چلنا چاہیے۔ لہٰذا ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کو ایک ساڑی خریدنا تھی۔ لیکن اب دھوپ کافی چڑھ چکی تھی۔ اس لیے سیدھے گھر پہنچے۔ آپا ڈیڑھ بجے پھر ڈاکٹر وارشنی پرنسپل ویمنس کالج، بی ایچ یو کے گھر چلی گئیں۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ نماز پڑھی عصمت آپا آ گئیں۔ ان سے باتیں ہوئیں۔ آپا کہنے لگیں رفعت جمال کون سی ہے؟ میں نے کہا ''میں ہی ہوں۔'' اس پر انھوں نے کہا میں سمجھ رہی تھی کہ تم ریسرچ اسکالر ہو۔ پرنسپل میڈم سے پتہ چلا لیکچرر ہو۔ گھمنڈ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ پرنسپل تمھاری بہت تعریف کر رہی تھیں۔ اس بات پر قمر آپا کا ذرا موڈ خراب ہو گیا۔

آج عصمت آپا کو بمبئی واپس جانا تھا۔ ڈاکٹر آمود پرکاش جی ہم لوگوں کو لینے آئیں گے۔ آپا کے کہنے پر میں بھی تیار ہو گئی۔ ڈاکٹر وسبھاوتی کے گھر رات کا کھانا تھا۔ اس کے بعد وہیں سے آپا کو اسٹیشن جانا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے، ہم لوگ ان کے ساتھ ندیسر چلے گئے۔ بہت لذیذ کھانا کھایا اور عصمت آپا کی چٹپٹی باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ ٹرین کا وقت ہونے پر اسٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں کچھ نوجوانوں نے انھیں پہچان لیا، ارے یہ تو 'جنون' کی ہیروئن ہے۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ لگنے لگی کہ ٹرین آ گئی۔ آپا ٹرین میں بیٹھ گئی ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ایسا منظر تھا جیسے کوئی اپنوں سے بچھڑتا ہے۔ جب تک وہ نظر آتی رہیں ہاتھ ہلاتی رہیں اور میں بھی بہت غمزدہ تھی۔

چلتے وقت عصمت آپا نے مجھے تاکید کی تھی کہ بمبئی ضرور آنا، میں بہت سی کتابیں دوں گی۔ یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی کیونکہ نہ میں بمبئی گئی اور نہ خط و کتابت کی۔ ان کے انتقال کی خبر نے مجھے رنجیدہ کیا مگر قلم نہیں اٹھایا، اچانک ایک دن ان کو خواب میں دیکھا وہ کہہ رہی تھیں کہ ''کینچلی' کے نام سے کہانی لکھو''۔ میں نے اسی دن فیصلہ کیا کہ آپا کی کہانی انھیں کی زبانی تحریر کروں گی۔ آج یہ کام مکمل ہو گیا۔ مگر تشنگی باقی ہے میں اگر اس کو 84-1983 تک لکھ کر چھپوا دیتی تو لوگوں کو کچھ نئی باتیں پتہ چلتی اس کے بعد ان پر تحقیقی کام ہوا۔ ان کے انٹرویو لیے گئے وہ ضرور چھپے ہوں گے مگر میری یہ باتیں ان کو پڑھنے کے قبل لکھی گئی ہیں۔ پانچ سال قبل لکھا گیا مضمون ہے۔ امید ہے کچھ نئی باتیں اس کے ذریعہ لوگوں کے سامنے آئیں۔

□□□

Rifat Jamal
Dept. of Urdu, Women's College
B.H.U, Banaras-221005 (UP)

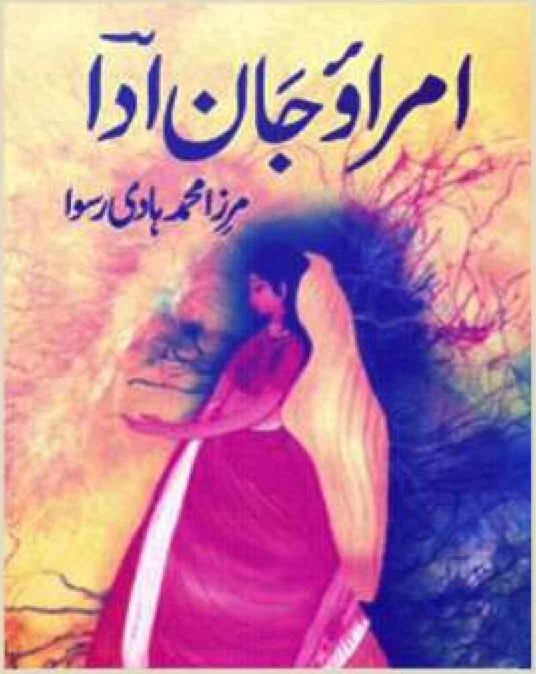

ڈاکٹر شبنم رضوی

امراؤ جان ادا
ایک جائزہ

'امراؤ جان ادا' ناول محمد مرزا ہادی رسوا کی تخلیق ہے۔ اس ناول کا موضوع لکھنوی تہذیب ہے۔ عہد نوابین میں طوائفوں کا بول بالا تھا۔ مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا میں طوائف کلچر کو پیش کیا ہے۔ طوائف جو اس زمانے کی سب سے اہم کڑی تھی، کے ذریعہ لکھنؤ کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی صورتِ حال کو اُسی کی زبانی بیان کروایا ہے۔

امراؤ جان ادا ایک کرداری ناول ہے۔ اسی لیے پوری کہانی امراؤ جان کے اردگرد گھومتی نظر آتی ہے۔ دورانِ مطالعہ یہ احساس ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں دولت کی فراوانی تھی۔ عہد نوابین میں تہذیب کے رکھ رکھاؤ کا معیار کیا تھا اور کیسا تھا اور سماج میں طوائفوں کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ بھی بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔

امراؤ جان میں رُسوا نے دو تہذیبوں کو پیش کیا ہے۔ ایک غدر سے پہلے دوسرے غدر کے بعد کے حالات۔ گویا ناول کے ابتدائی حصہ میں نوابین کا زرّیں دور نظر آتا ہے جہاں دولت کی فراوانی ہے۔ عیش و آرام، ناچ رنگ، مصاحب اور خدمت گار، نوکر چاکروں سے بھرپور نوابی ٹھاٹ ہے۔ اس کا نقشہ رُسوا نے کیا خوب کھینچا ہے:

''والد مرحوم چونکہ رشوت نذرانہ کے روپے سے ایک بڑا علاقہ چھوڑ گئے ہیں اس لیے دولت کو بے دردی سے لٹاتے ہیں۔ لکھنؤ آنے سے پہلے راشد تخلص کرتے تھے۔ یہاں آنے کے بعد کسی نے مرشد بنادیا۔ آپ اسی میں خوش تھے۔ وطن سے ہمراہ آئے ملازم انہیں 'رکھن میاں' کہتے۔ لکھنؤ والوں نے انہیں 'راجہ صاحب' کا لقب عطا کیا۔ انہیں پہلے امراؤ جان سے عشق ہوا اور رفتہ رفتہ جنوں کی حد تک ہوگیا تھا......'' (681)

راشد علی اُس طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں جو روایت شکنی کو گناہ سمجھتا ہے مگر گاؤں کو چپکے سے رہن رکھ دینے کو گناہ نہیں سمجھتا اور یہی راشد علی امراؤ جان کا پہلا خریدار بھی بنتا ہے۔

امراؤ جان ادا ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ بچپن میں امیرن کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس کے والد جمعدار تھے اور ایک سچی گواہی کی سزا انھیں یہ ملی کہ دلاور خاں نے ان کی بیٹی کو اغوا کر کے ایک ڈیرادار طوائف خانم کے کوٹھے پر سوا سو روپے میں بیچ دیا۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے وہیں ایک لڑکی رام دیئی بھی بکنے آئی تھی۔ امیرن کو خانم کا کوٹھا ملا اور رام دیئی کو نواب کی کوٹھی نصیب ہوئی۔ رسوا کا کمال ہے کہ ان دونوں کو ایک ایسے موڑ پر ملاتیں ہیں جہاں نواب سلطان امراؤ جان کے عاشق سے رام دئی کی شادی ہوچکی ہے۔ بیٹے کی تقریب میں امراؤ جان کو مُجرے کے لیے بلایا جاتا ہے۔ تینوں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ یہ کشمکش بہت عمدہ ہے۔ ایک طرف نواب سلطان شرمندہ ہیں۔ نظریں جھکائے بیٹھے ہیں تو دوسری طرف رام دئی امیرن کا حال جاننے کو بے تاب۔ کیا خوب بیان ہے۔ داستان عشق کی ادھوری کہانی، آنکھوں کے اشاروں کا اتنا عمدہ بیان شاعری کے علاوہ نثر میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔

''......نواب صاحب نے آنکھ بچا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ میں بول سکتی ہوں۔ منھ سے بولنے کا موقع نہ تھا مگر اس وقت

آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت، رمزو کنایہ سب اشاروں میں ہوگیا۔(881)

طوائفوں کے یہاں تعلیم وتربیت کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ جب کسی لڑکی کو طوائف کے پیشے میں ڈالا جاتا ہے اس وقت مسّی کی رسم ہوتی ہے۔ اس بیان میں رسوا نے بہت ہنر دکھایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے ہوئی رسم آج ہمارے سامنے ہو رہی ہے۔ اس سے نہ صرف مسّی کی رسم کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس وقت کی تقاریب کیسی ہوتی تھیں اور اس میں کیا کیا گل بوٹے سجتے تھے اس کا بھی نہایت خوبصورت بیان پڑھنے کو ملتا ہے۔

"دلاور رام کی بارہ دری اس جلسے کے لئے سجائی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم، ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گوئیے دلّی تک سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔"(27)

نوابین کے عہد میں طوائفوں کو رکھنا ایک رواج ہو گیا تھا۔ کوئی امیر رئیس ایسا نہیں جس نے چھوٹی بڑی کسی بھی طرح کی طوائف سے رشتہ نہ رکھا ہو۔ ضعیف سے ضعیف اور معتبر سے معتبر آدمی بھی طوائف سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ امراؤ جان اپنی کہانی بتاتے ہوئے بیان کرتی ہے کہ:

"...... اسی زمانے میں نواب جعفر علی خاں صاحب کی ملازمت ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منھ میں ایک دانت نہ تھا۔ پشت خم ہوگئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ ان کی کیچلی کا اور گلبدن کا پائجامہ، لال نیفہ، مصالحہ دار ٹوپی، کا کلیں بنی ہوئی۔ عمر بھر نہ بھولیں گے...... پچھتر روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹہ کے لئے مصاحبت کرکے چلی آتی۔"(201)

لکھنؤ میں سرائے اور بھٹیاروں کا کافی چلن تھا۔ مرزا رسوا نے چلتے چلتے جو ذرا سا بیان کیا ہے کیا خوب ہے:

"...... سرِ شام میں اپنی کوٹھری کے سامنے بیٹھی ہوں۔ مسافر آتے جاتے ہیں۔ بھٹیاریا چلا رہے ہیں۔ میاں مسافر ادھر ادھر مکان جھاڑا ہوا ہے۔ ٹھنڈا پانی کو آرام، کھانے پینے کو آرام، گھوڑے، ٹٹو کے لئے نیم کا سایہ......"(561)

لکھنؤ کا ذکر ہو اور لوازمات طعام کا ذکر نہ ہو یہ تو ممکن نہیں۔ مرزا رسوا نے کیا مزے لے لے کر امراؤ جان ادا سے کھانوں کا ذکر کروایا ہے کہ پڑھنے والوں کے منھ میں پانی آجاتا ہے۔ امراؤ جان ادا کا دسترخوان ملاحظہ ہو:

"دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بریانی، مزعفر، متجن، سفیدہ، شیر برنج، باقر خانیاں کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربّے، میٹھا دہی، بالائی وغیرہ وغیرہ......"(881)

لکھنؤ میں بغیر مصاحب کے نہ مرد رہتے تھے نہ عورتیں۔ امراؤ جان ادا میں جہاں بیگم صاحبہ کا ذکر ملتا ہے وہاں ان کے ساتھ مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں، مامائیں بھی ہیں۔ یہاں ہنر اور سلیقہ کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ یہ ہنر چاہے طوائف کا ہو یا بیگم صاحبہ کا۔ بیگم صاحبہ نے جب امراؤ کو گانے کا حکم دیا تو طبلہ پر ان کی خدمت گار اور ستار پر بیگم صاحبہ نے سنگت دی۔

ایک طرف لکھنوی تہذیب میں ناچ رنگ، راگ راگنی کا ذکر ملتا ہے تو دوسری طرف مشاعرے اور محرم کا بیان بھی موجود ہے۔ گو کہ امراؤ جان ادا کی تمام زندگی طوائف کے کوٹھے پر گزری تھی مگر مرزا رسوا کی فنی مہارت یہی ہے کہ طوائف کے کوٹھے سے لکھنؤ کی تہذیب کی ہر جھلک دکھا دی گئی ہے۔ ایک جگہ مشاعرے کا بیان کرتے ہیں۔ آج کے دور میں جہاں مشاعرے سیاسی منچ پر اور ویڈیو، ٹی وی تک محدود ہوگئے ہیں ایسے میں پرانے مشاعرے کی تیاری بہت ساری معلومات کے ساتھ مزا بھی دیتی ہے اور خوبصورت منظر کشی کا بیان بھی، یہاں "دلّی کا ایک یادگار مشاعرہ" یاد آتا ہے جو فرحت اللہ بیگ کی تصنیف ہے۔ ملاحظہ ہو:

"گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا۔ تاکہ شام تک زمین سرد رہے۔ اس پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالیس کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ کاغذ کی ہڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں رکھ دی گئی تھیں۔"(11)

لکھنؤ میں میلوں ٹھیلوں کا بہت رواج رہا ہے۔ عیش باغ کا میلہ خاص تھا جس کا ذکر مزیدار انداز میں امراؤ جان ادا سناتی ہے اور مزے لے لے کے مرزا رسوا سنتے ہیں۔ آیئے ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں:

"میلے میں وہ بھیڑ تھی کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے، جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں، خونچے والے، میوہ

فروش، ہار والے، تنبولی، سائیں غرضیکہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے۔ سب کچھ تھا......"

میلوں کے ساتھ ہی ساتھ لکھنؤ کی مشہور عزاداری کا بیان بھی ملتا ہے۔ یہاں مرثیہ، نوحہ، ماتم، مجلس، علم سبھی کا بیان ہے۔ طوائفیں بھی اس بات کا لحاظ رکھا کرتی تھیں اور چالیس روز ان کے کوٹھے بند رہتے۔ نہ مجرے ہوتے نہ ناچ گانے کی محفلیں سجتیں۔ نہ عاشقوں کی اٹھکھیلیاں نہ معشوق کے نخرے، نہ فرمائش، نہ گجرے نہ ہار، نہ لینا نہ دینا۔

امراؤ جان ادا کی آواز بہت اچھی، میٹھی اور درد بھری تھی جہاں انھیں گانے اور مجرے کے لیے بلایا جاتا تھا وہیں مرثیہ خوانی کی دعوت بھی ملتی تھی اور بہت احترام و عزت کی جاتی تھی۔

رسوا سے قبل کے ناول نگاروں نذیر احمد، سرشار، شرر وغیرہ کے یہاں مواد کا وسیع منظر نظر آتا ہے مگر جو انسانی گہرائی، نفسیاتی بصیرت، ذہنی سوجھ بوجھ اور اخلاقی طور طریقہ یہاں نظر آتا ہے پہلے کے ناولوں میں نظر نہیں آتا۔ یہ پہلا ناول تھا جہاں عورت کے ہر روپ کو دل کھول کر بیان کیا گیا۔ ماں، بیٹی، طوائف، محبوبہ، بہن، گود لی ہوئی بیٹی، نواب زادی وغیرہ۔ عورت کی زندگی کے ہر روپ پر توجہ دی گئی۔ امراؤ جان بچی تھی، بہن تھی، بیٹی اور پھر اغوا کی ہوئی ایک نفرت کی آگ میں جلنے، دل کو ٹھنڈک پہنچانے والی دوا بھی تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت، موسیقی، شاعری، مجرا، مرثیہ، شاعری گویا عورت کے ہر روپ کو بخوبی پیش کیا گیا ہے وہ بھی پوری ایمانداری اور نفسیات کے ساتھ۔

ناول کے اختتام پر ہم امراؤ کو اتنا زیادہ جاننے لگتے ہیں کہ وہ ہمارے آس پاس کی کوئی لڑکی نظر آتی ہے جو صدیوں مصیبت جھیل کر بھی ہمت اور حوصلے سے عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ عورت کے بھرپور مطالعہ کے لیے امراؤ جان سے بہتر کوئی ناول نہیں ہے یہی اس ناول کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

●●●

Dr. Shabnam Rizvi
Head Dept. of Urdu
Karamat Hussain Muslim Girls PG College
Nishat Ganj, Lucknow-226006 (U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. بتاریخ ....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language مسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

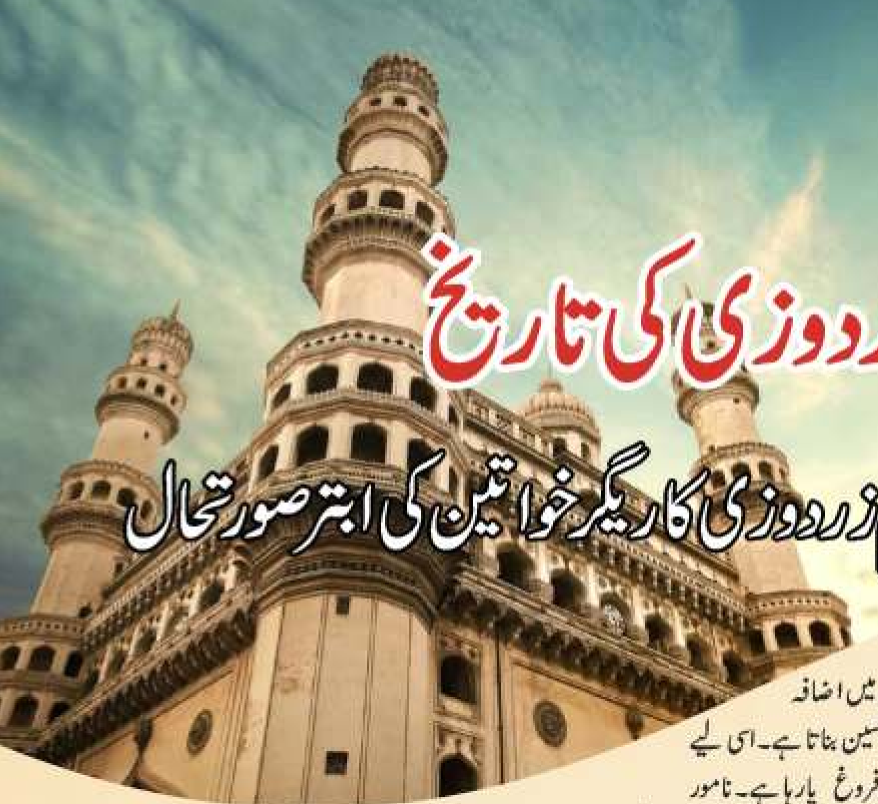

ڈاکٹر اسماء انجم

زردوزی کی تاریخ

حیدرآباد کی مسلم زردوزی کاریگر خواتین کی ابتر صورتحال

کشیدہ کاری یا ایمبرائیڈری

ایک ایسا آرٹ ہے جو لباس کی خوبصورتی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ پہننے والے کو بھی خوبصورت و حسین بناتا ہے۔ اسی لیے کشیدہ کاری و ایمبرائیڈری کا فیشن تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ نامور ڈریس ڈیزائنر کے بنائے گئے ایمبرائیڈری ملبوسات لاکھوں مالیت میں فروخت ہو رہے ہیں۔ ان ملبوسات کو عام کرنے کے لیے فیشن شو منعقد کیا جاتا ہے۔ فلم انڈسٹری کی نامور ہستیاں کیٹ واک کرتے ہوئے ان ملبوسات کی تشہیر کرتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں نقش ونگار کے ملبوسات صرف راجہ ومہاراجہ زیب تن کیا کرتے تھے۔ خواتین تو اس طرح کے ملبوسات بچپن سے ہی پہنا کرتی ہیں۔ یہ ملبوسات کم عمر کے بچوں کو بھی پہنایا جاتا تھا لیکن اب تو یہ عام ہو گیا ہے۔ خواتین کے علاوہ مرد حضرات بھی طرح طرح کے نقش ونگار کے ملبوسات زیب تن کر رہے ہیں۔ یہ ملبوسات فیشن کا حصہ بن چکے ہیں۔ چاہے وہ مغربی ملبوسات یعنی کوٹ پینٹ، شرٹ پینٹ، ہو یا دیسی ملبوسات یعنی کرتا پائجامہ۔ ان ملبوسات پر ہمہ اقسام کی نقش ونگاری کو ضروری سمجھا جا رہا ہے۔ دراصل ایمبرائیڈری کے ذریعہ عام لباس کو تخلیقی صلاحیتوں سے بروئے کار لاتے ہوئے جدید اور منفرد بنایا جا سکتا ہے۔ جنوبی ایشیا میں ایمبرائیڈری مقامی، روایتی، شاہی اور کمرشیل اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

زردوزی کی تاریخ:

زردوزی ہندوستان کی سب سے قدیم اور سب سے خوبصورت کڑھائی ہے۔ مانا جاتا ہے کہ زردوزی دستکاری، ویدک ومہابھارت کے دور سے موجود ہے۔ زردوزی راجہ، مہاراجہ، بادشاہوں، نوابوں، رانیوں کے ملبوسات میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہی نہیں ان کے درودیوار پر بھی اس کا نقش ونگار ضروری سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، فرنیچر اور برتنوں پر بھی اس کا استعمال عام تھا۔ تاریخی شواہد یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس کا استعمال رگ وید کے زمانے میں بھی کیا جاتا تھا۔ قرون وسطی اور نوآبادیاتی دور میں اس کے استعمال میں بے حد اضافہ ہوا۔ روایت کے مطابق اس کو تجارتی سرگرمیوں کے طور پر زیادہ قبول کیا گیا ہے۔ تیرہویں صدی میں یہ دستکاری ہندوستانی معاشرے میں عام ہو گئی۔ عام خیال ہے کہ زردوزی ایران کی کھوج ہے۔ زردوزی دراصل چاندی و سونے کے تاروں کا ملا جلا دھاگہ ہوتا ہے۔ اس دھاگہ سے ہیرے وجواہرات کو ٹانکا جاتا ہے۔ مانا جاتا ہے کہ ہندوستان میں زردوزی کو سب سے پہلے دہلی کے پہلے ترک افغان سلطان نے متعارف کروایا تھا۔ اس کے بعد یہ دستکاری ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اس دستکاری کو شادی و بیاہ کے علاوہ بادشاہوں کے دربار کی زینت بھی بنائی گئی۔

زردوزی کے کام کو خالص سونے اور چاندی کے ساتھ ٹانکہ دیا جاتا تھا۔ اس میں خوبصورتی کے لیے موتی اور ہیرے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس کے کئی نام ہیں زیادہ تر اس کو کلابتون اور کارچوب سے جانا جاتا ہے۔ ابتدائی طور پر سونے اور چاندی کا استعمال کیا جاتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سونے اور چاندی کے داموں میں اضافہ کی وجہ سے خام مال مہنگا ہو گیا اور اس کی بنائی اور کڑھائی بھی مہنگی ہو گئی۔ اس کا نعم البدل ریشمی دھاگے اور سنہری چاندی سے کیا جانے لگا۔ دیوی دیوتاؤں

کے ملبوسات میں بھی اس کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ ہندوستان میں زردوزی کے اہم مراکز لکھنؤ، بھوپال، حیدرآباد، دہلی، آگرہ، کشمیر، ممبئی، اجمیر اور چینائی ہیں۔ مغل شہنشاہ کی زیرِ سرپرستی اس کام کو اور بھی فروغ دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد اس کام میں تنزلی آ گئی۔ اسی وجہ سے کئی زردوزی کاریگر دوسرے شعبوں کو اختیار کرنے لگے۔ کسی حد تک آزادیٔ ہند کے بعد اس صنعت کو فروغ دینے کا کام کیا گیا مگر اس کے باوجود اس کے شاہانہ انداز میں کمی دکھائی دی۔ اب تو صنعتوں کے فروغ کے بعد ریڈی میڈ کام سستا ملنے کے بعد اور بھی کاریگر اس شعبہ سے دور ہوتے گئے لیکن دوسری طرف اس شعبہ میں لاکھوں کی آمدنی حاصل ہو رہی ہے۔ ہاتھ کے بنے کڑھائی کے کام مہنگے ہو گئے ہیں۔ اس کے استعمال میں جدیدیت کے ساتھ انفرادیت بھی شامل ہو گئی ہے۔ موجودہ دور میں منفرد نقطۂ نظر اور پیٹرن کو شامل کیا جا رہا ہے۔ خصوصی طور پر ہاتھ سے کڑھائی کی گئی زردوزی کے رجحانات میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ انوکھا ڈیزائن اور انوکھے رنگوں اور پتھروں سے ڈالے گئے کام کی قیمت ہزاروں روپے ہوتی ہے۔ یہ یوروپین فیشن شو کا بھی حصہ بن رہا ہے۔ دہلی میں منعقدہ کامن ویلتھ گیمس میں زردوزی سے بنی اشیا فیشن شو کا حصہ بنی تھیں۔ ہر بڑے شہر کے بوتیک اور شورومس اپنے کاریگروں کو زردوزی کی خصوصی ٹریننگ دے رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ زمانہ قدیم میں مرد تاجروں کا غلبہ تھا خواتین اس میدان میں نہیں تھیں لیکن اب اس شعبہ میں خواتین بھی شامل ہو گئی ہیں۔ ویسے تو اکتوبر اور مارچ روایتی کرافٹ سیزن کا ہے جبکہ برآمدی آرڈر کے لیے ستمبر تا دسمبر اہم وقت ہوتا ہے۔ طلب و رسد کا انحصار تاجر کی کارکردگی، کارکنوں کی پیداوار، گھریلو و بیرونی مارکٹ، معیاری مصنوعات پر منحصر ہے۔ اس مارکٹ میں چند ایک مسائل بھی ہیں جیسے وسائل کی کمی، میچنگ دھاگہ کا نہ ملنا اور دیگر خام مال کا وقت پر دستیاب نہ ہونا شامل ہے۔ یہ کاروبار کنٹراکٹر اور ذیلی کنٹراکٹر کے ذریعہ ہوتا ہے۔ مرد حضرات ورک شاپس میں کام کرتے ہیں اور زیادہ تر خواتین کاریگر گھروں میں زردوزی کرافٹ کرتی ہیں۔ دیہی و شہری علاقہ جات میں روایتی اور جدید ڈیزائن سے آراستہ ہو کر یہ ایک انڈسٹری کی شکل اختیار کر چکی ہے مگر اس کے باوجود خواتین کو کارخانوں میں ملازمت نہیں ملتی بلکہ وہ گھروں میں رہ کر یہ کام کرتی ہیں۔ شہر حیدرآباد کے پرانے شہر کے بیشتر علاقوں میں زردوزی کاریگر خواتین گمنام زندگی گزار رہی ہیں۔

شہر حیدرآباد اور زردوزی کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ یہاں 400 سال تک نوابوں کا راج رہا ہے۔ نوابوں کی اپنی آن، بان اور شان رہتی تھی۔ ان کے ملبوسات، برتن، فرنیچر، قالین اور ساز و سامان میں زر و جواہرات کے علاوہ ہیرے کندہ رہتے تھے۔ زر کا استعمال عام تھا۔ زر یعنی سونا اور دوزی یعنی ایمبرائیڈری۔ ان کی شادیوں میں جہز کیلئے شوخ اور

رنگین مختلف دھاتوں اور ایمبرائیڈری سے لیس ملبوسات پہننے کا رواج عام تھا۔اس کا سلسلہ اب بھی ہے۔ان ملبوسات اور اشیا کو تیار کروانے کے لیے کاریگروں کی ضرورت رہتی ہے۔

حیدرآباد ہمیشہ سے ہی فن اور فنکاروں کا شہر رہا ہے۔انیسویں صدی کے پہلے عشرے کی بات کی جائے تو بیگم امیر حسن کا نام سرخیوں میں آتا ہے۔انھیں عورتوں کی اصلاح وترقی سے خاصی دلچسپی تھی۔بنجارہ ہلز کے مکان میں انھوں نے ایک مدرسہ کھولا۔جہاں بنجارہ عورتوں کو دستکاری سکھائی جاتی تھی۔بیگم برکت رائے کا نام بھی تاریخ میں ملتا ہے انھوں نے ان ہی دنوں میں حیدرآباد میں گھریلو صنعت کی بنیاد رکھی تھی۔اس گھریلو صنعت سے خواتین استفادہ کرتی تھیں۔یہاں کا مارکٹ بہت بڑا ہے کیونکہ یہ میٹرو شہر ہے۔پڑوسی ریاستوں کے علاوہ پڑوسی اضلاع سے بھی کئی خاندان آکر یہاں بس گئے ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔مقامی لڑکی کی شادی اگر دوسری ریاست کے لڑکے سے ہوتی ہے تو یہ لڑکے اپنے آبائی مقام کو چھوڑ کر یہیں مقیم ہونے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ملک وبیرون ملک کی کمپنیاں یہاں اپنا کاروبار کررہی ہیں۔ان کمپنیوں کے ملازمین کی بڑی تعداد کا تعلق دوسری ریاستوں اور دوسرے ممالک سے ہے۔تعمیراتی کام کرنے والے مزدور اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے کاریگروں کی بڑی تعداد بھی روزگار کی تلاش کے لیے یہاں کا رخ کرتے ہوئے اسی شہر کو اپنا آشیانہ بنا رہے ہیں۔ان ہی ہجرت کرنے والوں میں کئی افراد زردوزی شعبہ سے منسلک ہو چکے ہیں۔بہار اور اتر پردیش کے ہجرت کرکے آنے والے افراد کوئی بھی کام کم قیمت میں بھی کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کارخانہ مالکین مقامی کاریگر کے بجائے ہجرت کرکے آرہے افراد کو چند دن کی تربیت دے کر اپنے پاس ملازمت دے رہے ہیں۔ہم نے شہر حیدرآباد کے مسلم زردوزی کاریگر خواتین پر تحقیق کی۔

مطالعے کے لیے شہر حیدرآباد کی زردوزی کاریگر خواتین کی آبادی کا انتخاب کیا گیا۔ایسی خواتین جو معاشی وسماجی خوداختیاری حاصل کرنے کی سعی کررہی ہیں۔شہر حیدرآباد کے سلم علاقوں میں رہائش پذیر خواتین کا احاطہ کیا گیا ہے۔نادر ونایاب کاریگروں کی کمی اور ان کے سماجی اخراجات کے سبب ان تک پہنچنا انتہائی مشکل ہوگیا تھا۔کاریگروں تک پہنچنے کے لیے ورکشاپس، زردوزی کے لیے درکار اشیا کی دکانوں، بوتیک کے مالکوں سے رابطہ کرنا ضروری ہوگیا۔یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ بڑے بڑے کارخانوں میں بھی خواتین کاریگروں کو ملازمت نہیں دی گئی۔وجہ پوچھنے پر بتایا گیا کہ اگر ایک خاتون کو بھی ملازمت دیتی ہو تو ہم کو ان کے لیے الگ سے جگہ دستیاب کرنی ہوگی۔اس لیے شہر حیدرآباد کے لاڈ بازار، دبیر پورہ، کوٹھی اور کئی علاقوں میں زردوزی مرد کاریگروں سے ہی کام لیا جارہا ہے۔ خواتین کاریگر اپنے گھروں میں ہی کام کررہی ہیں۔یہ کاریگر حیدرآباد کے وٹے پلی، فرسٹ لانسر،سعیدآباد کی اندرونی گلی کوچے اور کئی سلم علاقوں میں موجود ہیں۔تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں ہے۔جب ہم نے تنگ گلیوں میں جاکر معلوم کیا تو اسی گلی کے دوسرے نکڑ کی کاریگر خواتین سے وہ لوگ ناواقف ہیں۔ان کاریگر خواتین کا المیہ یہ بھی ہے کہ ان کو کہیں کارخانوں میں کام نہیں ملتا۔انھیں خواتین میں سے کوئی ایک خاتون اپنے گھر کے ڈرائنگ روم کو کارخانہ کی شکل دے کر دوسری خواتین کو روزگار دے رہی ہیں۔لیکن یہ تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔کاریگر خواتین کو کام بھی راست نہیں ملتا۔درمیانی فرد کام لا کر دیتا ہے۔ظاہری بات ہے جو کام دے رہا ہے اس کا اپنا کمیشن بھی رہتا ہے۔ دکاندار زردوزی ملبوسات کو اونچے داموں میں فروخت کرتے ہیں۔ہم کو ایسی کئی خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوا جو دن رات ایک کرکے اپنی زندگی کے شب وروز کاٹ رہی ہیں۔ پرانا شہر کے کئی مرد حضرات بیروزگار ہیں یا پھر چند سالوں کے لیے خلیجی ممالک میں کام کرکے یہاں بیروزگار ہیں۔ان کو روزگار حاصل نہیں ہوتا۔چھوٹا کاروبار کرنے کے لیے ان کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ایسے میں گھر کی خواتین پر دوہری ذمہ داری آچکی ہے۔افسوس کی بات ہے کہ ان خواتین کی حالت زار کو دیکھنے کے لیے کوئی این جی او بھی سامنے نہیں آتی اور نہ ہی حکومت کی اسکیمات سے واقف کروانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات کئے گئے ہیں۔شہر حیدرآباد کے پرانا شہر کے سلم بستیوں میں رہنے والی کئی خواتین اپنی صبح زردوزی کے فریم سے شروع کرتی ہیں اور رات کے آخری پہر تک بغیر کسی آرام کے اسی پیشہ سے جڑی ہوتی ہیں۔اس کے باوجود ان کا رہن سہن انتہائی پسماندہ ہے۔جبکہ حیدرآباد کو نوابوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ٹائمس آف انڈیا کی خبر کے مطابق نواب عثمان علی پاشا کا اب تک کہ امیروں میں ساتواں مقام ہے۔امیر نواب کے شہر کی خواتین کی پسماندگی اس حد تک ہے کہ انھیں تین وقت کی روٹی جٹانا مشکل ہوجاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ زردوزی کاریگر خواتین کی بہتری کے لیے ٹھوس اقدامات کیے جائیں۔حکومت کی اسکیمات غریب وپسماندہ خواتین تک پہنچانے کی اشد ضرورت ہے۔اپنا کاروبار شروع کرنے کے لیے حکومت سبسیڈی پر قرضہ جات مہیا کررہی ہے۔قرضہ جات زردوزی کاریگر خواتین تک پہنچنے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

اگر شہر حیدرآباد کی زردوزی کاریگر خواتین کو اپنا کاروبار شروع کرنے کا موقع مل جائے تو ان کی زندگیوں کے علاوہ شہر حیدرآباد زردوزی کا ایک بڑا کاروبار بن سکتا ہے کیونکہ آج بھی زردوزی کی اہمیت اپنے مقام پر ہے۔ فلموں میں، شادی بیاہ کے مواقعوں پر، بڑے بڑے ہوٹلوں میں، فرنیچر میں، میڈلس میں ہر جگہ زردوزی کے کام کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ شہر حیدرآباد کی زردوزی کاریگر خواتین کو ٹریننگ دیں۔ جس طرح حکومت نے کسانوں کے لیے ہر محلّہ میں ریتو بازار کا اہتمام کیا ہے۔ اسی طرح زردوزی کاریگر خواتین کے مصنوعات کو عوام تک پہنچانے کے لیے شہر کے دو یا تین مقامات میں انتظام کیا جائے تو بہتر ہوگا تاکہ یہاں کی زردوزی کاریگر خواتین کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے اور وہ گمنام زندگی کے بجائے اپنی پہچان بنا سکے۔ اگر صحیح معنوں میں پرانا شہر میں ترقی چاہتے ہیں تو یہاں کی خواتین کو خود مختار بنانے کے لیے بنیادی سہولتوں کو یقینی بنائیں۔

2011 کی مردم شماری کے مطابق شہر حیدرآباد میں مسلمان جملہ آبادی کا % 30.13 فیصد ہے۔ خصوصی طور پر یہاں کے پرانا شہر کے پسماندہ بستیوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ غربت و پسماندگی کے لیے یہ علاقہ جانا جاتا ہے۔ غریب لڑکیوں کی عرب بوڑھوں سے شادیوں کے واقعات کی وجہ سے بھی یہ علاقہ سرخیوں میں رہتا ہے۔ معاشی کفالت کے لیے یہاں کے لڑکے کم عمری میں ہی خلیجی ممالک کا رخ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تعلیمی کمی کی وجہ سے خلیجی ممالک میں انھیں کوئی معقول نوکری نہیں ملتی اس لیے غیر منظم شعبوں میں ملازمت کرتے ہیں اور یہاں گھروں میں ان کی خواتین اکیلی رہنے پر مجبور ہوتی ہیں، اسی وجہ سے کئی خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک خوشحال وصحت مند معاشرہ کی تشکیل کے لیے مکمل خاندان کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں بھی یہ شہر کئی بار اپنوں کو کھو چکا ہے۔ ان فسادات میں لوگ جانی و مالی نقصانات کے علاوہ، عدم تحفظ کا شکار ہو رہے ہیں۔ معلوم نہیں کب کس وقت پولیس کا چھاپہ پڑ جائے اور مکان کی تلاشی کے بہانے بچوں کو پکڑ کر لے جائیں۔ پرانا شہر کے سلم بستیوں میں رہنے والے افراد بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔ ان علاقہ جات میں اسکول و کالجوں کی کمی ہے اور دور دراز مقامات پر جا کر پڑھنے کے لیے ٹرانسپورٹ کی بہتر سہولتیں بھی میسر نہیں ہیں۔ مسلم خاندان اپنی لڑکیوں کو دور دراز علاقوں میں بھیجنے سے گریز کرتے ہیں۔ بیروزگاری، غربت اور تعلیم کی کمی جیسے مسائل یہاں موجود ہیں جبکہ خود مختاری اور خود اختیاری کے لیے فرد واحد کو یہ تمام مواقع میسر ہونا ضروری ہے۔ زردوزی کاریگر خواتین کو بھی یہ تمام مواقع ملنے چاہئیں۔ □

Dr. Asma Anjum
H.No-17-3-2/6
Suryar jung devdi, Yakutpura
Hyderabad-500023 (T.S)

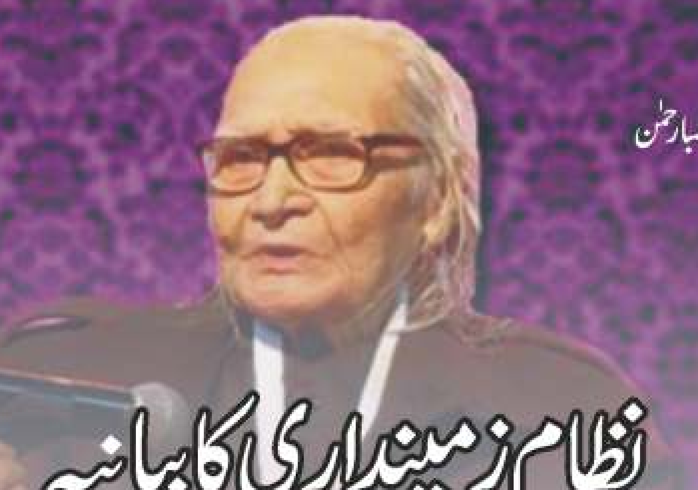

صبا رحمن

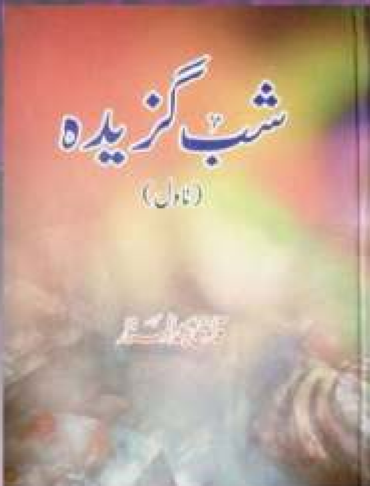

نظامِ زمینداری کا بیانیہ
''شب گزیدہ''

عصرِ حاضر کے ممتاز فکشن نگار قاضی عبدالستار (1933-2018) نے اپنی تخلیقی زندگی کی ابتدا ایک شاعر کی حیثیت سے کی۔ صہبائی تخلص اختیار کیا اور اس میں بہت مہارت کا ثبوت پیش کیا۔ علاوہ ازیں 1948 میں ایک افسانہ ''اندھا'' کے عنوان سے لکھا لیکن شاعری کے شوق نے انھیں دوسری تمام اصناف سے غافل کر دیا اور وہ اپنے خوبصورت تشبیہات و استعارات سے غزلیں، قطعات وغیرہ لکھتے رہے لیکن ایک دن ان کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ شاعری ترک کر دی۔ اس حوالے سے ابنِ کنول لکھتے ہیں:

> ''ہوا یہ کہ بارہ بنکی کے مشاعرہ میں گئے وہاں ایک رئیس کے مہمان خانہ میں آرام کر رہے تھے کہ کچھ لڑکیاں ادھر کو آتی ہوئی دکھائی دیں لیکن فوراً ہی پیچھے سے ان کی ماں دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں ''اے لڑکیوں ادھر مت جانا ادھر وہ شاعر ٹھہرا ہے'' قاضی صاحب نے سوچا کہ شاعر ایسی چیز ہے کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو بھی اس کے سامنے جانے سے روکتے ہیں اور شاعری بالکل چھوڑ دی۔''

(پروفیسر ابنِ کنول، اردو افسانہ، دہلی، کتابی دنیا 2011، ص 53)

شاعری ترک کرنے کے بعد قاضی عبدالستار نثر کی طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے ''ٹھاکر دوارہ، رضو باجی، نومی، ایک دن، پیتل کا گھنٹہ، دھندلے آئینے، مالکن، پرچھائیاں، ماڈل ٹاؤن'' وغیرہ جیسے عمدہ افسانے لکھے اور ساتھ ہی پے در پے ناول بھی لکھے۔ ان کا سب سے پہلا ناول ''شکست کی آواز'' ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ''شب گزیدہ، غبارِ شب، مجو بھیا، بادل'' وغیرہ جیسے بہترین ناول لکھے لیکن ان کی والدہ نے ''بادل'' پڑھا تو قاضی عبدالستار سے فرمایا کہ جب تم ہاتھی پر لکھ سکتے ہو تو ''صلاح الدین ایوبی'' پر تمھیں ضرور لکھنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے تاریخی کردار پر مشتمل ناول لکھنا شروع کر دیا اور ''دارا شکوہ'' لکھنے کے بعد ''صلاح الدین ایوبی، حضرت جان، خالد بن ولید، تاجم سلطان جیسے تاریخی ناول لکھ کر اردو ادب میں تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر لی۔

قاضی عبدالستار کے مذکورہ بالا تمام ناولوں کی اہمیت مسلم ہے جس پر ناقدین نے اپنی اپنی آرا سے نوازا بھی ہے لیکن ''شب گزیدہ'' پر تفصیلی بحث کا فقدان نظر آتا ہے جبکہ ''شب گزیدہ'' ایک ایسا ناول ہے جس میں آزادی سے قبل دم توڑتی زمیندرانہ اور جاگیردارانہ نظام کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ حالانکہ قاضی صاحب سے قبل پریم چند، سرشار وغیرہ کے ناولوں میں بھی جاگیردارانہ اور زمیندرانہ نظام کی عکاسی کی گئی ہے لیکن انھیں ظالم و جابر بنا کر پیش کیا گیا ہے جو معاشرے میں غریب کسانوں پر بے جا ظلم کرتے اور ان کی محنت و مزدوری کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں ہر طرح سے پریشان کرتے ہیں لیکن قاضی عبدالستار کا ناول ''شب گزیدہ'' کا موضوع ترقی پسندوں کے بنائے ہوئے طریقوں سے بے حد مختلف ہے۔ ''شب گزیدہ'' کی کہانی پڑھ کر زمینداروں سے نفرت کے بجائے

ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ہارون ایوب رقمطراز ہیں:

''شب گزیدہ' پہلا ناول ہے جس میں زمیندار اور کسان ترقی پسند تحریک کے بنائے ہوئے خانوں کو توڑ کر نکل آئے ہیں یہاں تک کہ کسان مجبور اور مظلوم ہونے کے علاوہ ایک فرد بھی ہے۔ زندہ، آزاد اور طاقتور بھی ہے۔ جاگیردار ایک جابر و ظالم اور طاقتور ہونے کے علاوہ دکھی اور شکست خوردہ بھی ہے۔ اس لیے مطالعہ کے دوران اس سے نفرت نہیں ہوتی ہے اور ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ وہ ٹائپ کردار نہیں بلکہ زندہ، جیتے جاگتے اور ہماری طرح سانس لینے والے انسان ہیں۔''

(ڈاکٹر ہارون ایوب، اردو ناول پریم چند کے بعد لکھنؤ: اردو پبلیشر 1978، ص 222)

زمیندرانہ اور جاگیردرانہ ناول لکھتے وقت جن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ان تمام فنی خوبیوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قاضی عبدالستار نے ''شب گزیدہ'' کی تخلیق کی ہے۔ اگر اس میں انھوں نے زمینداروں کی خوبیوں اور اچھائیوں کو ظاہر کیا ہے تو ان کے اندر پیدا شدہ خامیوں کو بھی دکھایا ہے جو اپنے اقتدار اور اپنی انا کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے قریبی رشتے تک کو پامال کر دیتے ہیں۔ ناول ''شب گزیدہ'' کے حوالے سے قاضی عبدالستار اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''شب گزیدہ' میں میں نے کوشش کی ہے کہ وہ تمام باتیں آجائیں جو بحیثیت تخلیق کار مجھے اندر سے بے چین کر رہی تھیں۔ اس ناول میں میں نے زمیندارانہ نظام کے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا ہے۔ دنیا کے سب سے ظالم جانور کا نام زمیندار ہے۔ وہ اپنی زمینداری پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے اپنے بیٹے، باپ، بھائی کسی کو بھی ذبح کر سکتا ہے۔ اگر اس کو کسی کا ہاتھی یا گھوڑا پسند آ گیا تو اس کے حصول کے لیے گھروں کو اجاڑ سکتا ہے، لیکن اپنے ہاتھ سے زمام اقتدار کو نکلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ''شب گزیدہ'' میں میں نے قدیم تصورات کے حامل زمیندار اور نئی قدروں کے حامل اس کے اکلوتے بیٹے کے ٹکراؤ کی کہانی پیش کی ہے جو کچھ بھی میں نے ناول میں پیش کیا ہے وہ حقیقی واقعے پر مبنی ہے۔''

(راشد انور راشد، قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار، دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز 2014، ص 253)

جام نگر کے تعلقدار اور ان کے بیٹے جمی کی کہانی کو بنیاد بنا کر ''شب گزیدہ'' لکھا گیا ہے۔ جمی کے والد مرزا صاحب یعنی جام نگر کے بڑے سرکار قدیم خیالات کے حامل اور عیش پرست شخصیت کے مالک

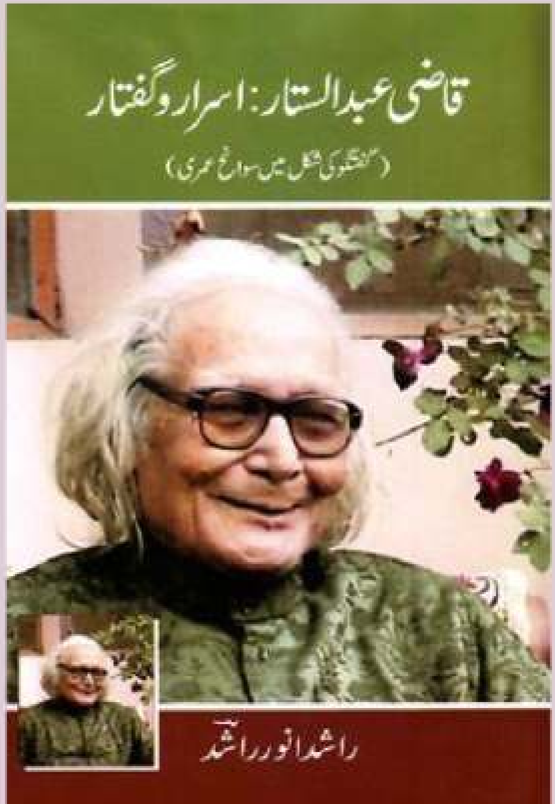

ہیں۔ جبکہ ان کا بیٹا نہ صرف یہ کہ روشن خیال بلکہ روشن خیالی کو فروغ دینے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باپ اور بیٹے میں روز بہ روز اختلافات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بڑے سرکار جو رحمت علی خاں کی بیوی مہرن اور سالی چندا کے ساتھ عیاشی میں مبتلا ہیں، اسی بات کا رحمت علی خاں فائدہ اٹھا کر بڑے سرکار کی دولت پر حکومت کرتا ہے۔ لیکن جب جام نگر کا اکلوتا وارث رحمت علی کے کام میں مداخلت کرتا ہے، ریاست میں اصلاح کرنا چاہتا ہے تو رحمت علی خاں کو یہ ساری بات ناگوار گزرتی ہے۔ وہ بڑے صاحب کو ان کے بیٹے کے خلاف ہر وقت غلط مشورہ دیتا رہتا ہے۔ بڑے صاحب چونکہ رحمت علی کی بیوی اور سالی کے عشق میں مبتلا ہیں اس لیے رحمت علی کے قدیم اور دقیانوسی کاموں کے مشوروں پر بڑے صاحب ہمہ وقت عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ خاں صاحب کے سامنے بڑے سرکار اپنے تعلیم یافتہ بیٹے جمی کی کسی بات کو اہمیت نہیں دیتے، لیکن جمی ان سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ وہ گندی ذہنیت اور قدامت پرستی کا شکار نہیں ہوتا جبکہ چندا جمی کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے مولوی صاحب سے بھی ملتی ہے تا کہ جمی اس سے پیار کرنے لگے لیکن جمی اپنی پھوپھی زاد زبیدہ سے محبت کرتا ہے اور اسی سے شادی کی بھی خواہش رکھتا ہے۔ جمی کے والد صاحب کو سکندر پور والے بہنوئی

سے تعلقات اچھے نہیں ہوتے ۔وہ نہیں چاہتے کے جمی کسی کام میں مدد کے لیے یاان سے ملنے کے لیے سکندر پور جائے۔وہ اس بات کے بھی مخالف ہیں کہ جمی ان کی لڑکی سے شادی کرے۔

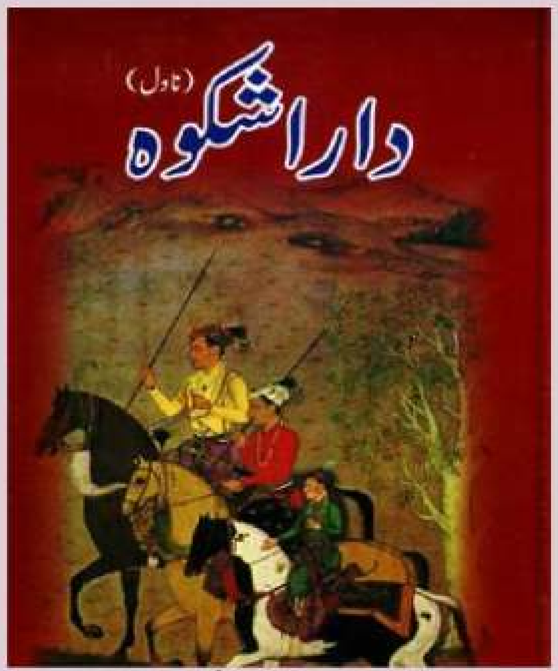

جمی ریاست کے کاموں کے ساتھ دیگر چیزوں کو بھی زمانے کے حساب سے ڈھالنا چاہتا ہے ۔ وہ ہاتھی اور گھوڑے کی جگہ موٹر کار لینا چاہتا ہے اور ساتھ ہی گھر کے قدیم برتنوں اور دوسرے سامانوں کو بھی تبدیل کرنا چاہتا ہے لیکن بڑے سرکار جن کو دنیا میں ہو رہی تبدیلی کا ذرا بھی علم نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ عیش وعشرت میں پڑے رہتے ہیں۔ان کو یہ گمان ہے کہ ان کی حکومت یعنی زمینداری دائمی ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوگی ۔جمی بہت فکر مند رہتا ہے ۔وہ اپنے والد کو ان تمام قدیم خیالات سے نکالنا چاہتا ہے۔انھیں سمجھانا چاہتا ہے۔ نئے تقاضوں کے مطابق انھیں ڈھالنا چاہتا ہے اوران سے کہتا ہے:

’’لو! یہ بات میں نے اس لیے گوش گذار کی تھی کہ آئے دن اخباروں میں یہ آتا رہتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے اور ہندوستان آزاد ہونے کے بعد کانگریسی حکومت جو کام سب سے پہلے کرے گی وہ یہ کرے گی کہ زمینداری ختم کرے گی۔‘‘

’’کیا؟‘‘

ابوا تنے زور سے گرجے کہ جمی پریشان ہوگیا۔

’’میری زمینداری چٹائی ہے؟ دری ہے؟ جاجم ہے؟ آخر کیا ہے؟ زمینداری ختم ہو جائے گی اور ہم تماشہ دیکھا کریں گے؟‘‘

’’میں کہہ رہا تھا۔‘‘

’’تو جھک مار رہا تھا۔ بدمعاش! دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔‘‘

(قاضی عبدالستار،شب گزیدہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2014،ص99)

قصے کا اختتام کچھ یوں ہوتا ہے۔جمی ریاست کے کاموں میں مداخلت کرنے لگتا ہے۔گھر سے باہر تک عوام کی ساری ذمہ داری کو وہ بہ حسن وخوبی سنبھالتا اور عوام کی فلاح و بہبود چاہتا ہے تو خان صاحب کو ناگوار گزرتا ہے اور وہ بڑے سرکار کو مشورہ دیتا ہے کہ چھوٹے سرکار کی شادی کردیں۔ پھر کیا، بڑے سرکار جمی کی شادی کا اعلان کرتے ہیں تو جمی انکار کردیتا ہے جسے بڑے سرکار اپنی توہین سمجھ کر جمی سے انتقام لینے کے لیے اسے اپنے پاس بلا کر برفی پیش کرتے ہیں لیکن جمی اسے کھاتے وقت ڈرتا ہے اور اسے اپنی ماں کی کہی ہوئی یہ بات یاد آتی ہے:

’’اس کے کان میں امی کی آواز آئی کہ دیکھو بیٹے تم اس وقت تک کوئی چیز نہ کھانا جب تک میں خود لے کر اسے تمہارے پاس نہ آؤں۔ دیکھو یہ قاب تمہارے دادا کی ہے۔اس کی تاثیر یہ ہے کہ اس قاب میں زہر ملی ہوئی چیز دس منٹ بھی رکھ دی جائے تو اس میں بال پڑ جائے گا۔میں نے یہ قاب اسی لیے نکالی ہے کہ اب تم کھانا صرف اسی میں کھایا کروگے اور دیکھو بیٹے میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ تمہارے باپ بھی کوئی چیز تم کو دیں تو تم کھانا نہیں۔ وہ چاہے جتنا خفا ہوں مگر نہ کھانا۔ وہ تمہارے باپ ہیں لیکن میرے جنم جنم کے ساتھی ہیں۔میں ان کو بتیس برس سے جانتی ہوں۔۔۔۔۔سنا تم نے ؟ پھر اس نے دیکھا کہ اسی برفی کی پلیٹ سے اتنا ہی بڑا ٹکڑا اٹھا کر لاؤ نے اپنے منہ میں رکھ لیا۔۔۔۔۔اس نے وہ ٹکڑا اپنے منھ میں رکھ لیا۔قدر خشک برفی کا یہ ٹکڑا اس کے منہ میں پہنچتے ہی گھل گیا۔‘‘

(شب گزیدہ، قاضی عبدالستار، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2014،ص154)

جمی نے زہریلی برفی کھائی تو اسے اپنے سر میں سنسناہٹ محسوس ہونے لگی اور گھوڑے تک پہنچتے ہی اس کا سر چکرانے لگا اور وہ گر پڑا۔اس کی موت واقع ہوگئی۔اس طرح جمی کا کردار انجام کے اعتبار سے ایک

المناک تاثر پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قصہ کا انجام بہت ہی دردناک ہے۔ علاوہ ازیں دلکش ودلچسپ بھی ہے۔ ان تمام قصوں کے علاوہ قاضی عبدالستار نے اس زمانے کے زمینداروں کے طور طریقے اور ساتھ ہی رسم ورواج، تیوہاروں کو بھی بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ محرم کے موقع پر ہونے والے مرثیہ خوانی اور ماتم کو انھوں نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

''جوان جوان لڑکیاں اتنے زور سے ماتم کرنے لگیں کہ چمن آرا اور شبو ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ جمی اور اختر بھائی تک کمرے سے نکل آئے اور اوپر ہی سے ریلنگ پر جھک گئے اور دالان میں ہوتا ہوا ماتم دیکھنے لگے۔۔۔۔کار چوبی کے شمگیرے کے نیچے چاندی سے منڈھا ہوا چھوٹا سا منبر رکھا تھا جس پر لکھنؤ سے بلوائے ہوئے اخگن صاحب اپنے خاص انداز میں حضرت حر کا مرثیہ پڑھ رہے تھے میر صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ عورتوں کے حصے سے بھی سسکیوں کی آوازیں آرہی تھی۔''

(قاضی عبدالستار، شب گزیدہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2014، ص 80)

ناول میں قصہ نگاری سب سے اہم ترین عنصر ہے۔ اس کے بغیر کوئی ناول یا کہانی ناممکن ہے اور اس کی اہمیت سے قاضی عبدالستار بخوبی واقف تھے۔ ناول ''شب گزیدہ'' کو پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس میں قصہ کو بے جا طول نہیں دیا گیا ہے اور ایسی عام فہم زمیندرانہ اور عوامی زبان کو استعمال کیا گیا ہے کہ قصہ مجروح نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی پڑھنے میں اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے بلکہ تمام واقعات فطری معلوم ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اسلم آزاد:

''قاضی عبدالستار صاحب واقعہ نگاری کا پختہ اور بالیدہ شعور رکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے واقعات میں بھرتی کے واقعات نہیں ملتے۔ مرکزی قصہ پورے اہتمام وتنظیم کے ساتھ اپنے اختتام کی طرف بڑھتا ہے۔ واقعات کی باہمی ترتیب کا سلیقہ قاضی عبدالستار صاحب کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ واقعوں کے نشیب وفراز کے موقع ومحل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ''شب گزیدہ'' کے واقعات میں گہرا ربط اور مضبوط تنظیم ہے۔''

(ڈاکٹر اسلم آزاد، اردو ناول آزادی کے بعد، مئوناتھ بھنجن: نکھار پریس، 1981، ص 396)

فکشن کی عظیم ہستی قرۃ العین حیدر نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ قاضی عبدالستار کو کہانی لکھنے میں اس قدر مہارت حاصل تھی کہ وہ تمام واقعات کو ان کے کردار کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ ان کی کہانی میں بھرتی کے کردار نہیں ہوتے ہیں۔ جس سے قصہ حقیقی اور جیتا جاگتا معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

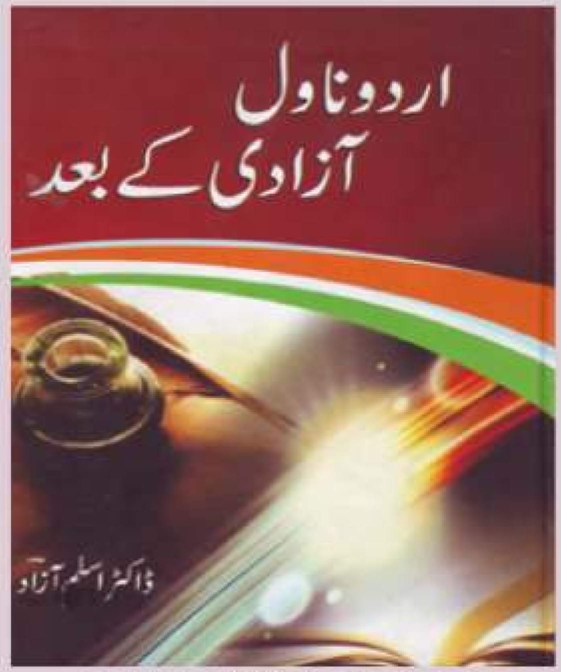

''نہ صرف یہ کہ قاضی عبدالستار کو کہانی سنانے کا ڈھنگ آتا ہے بلکہ اپنے موضوع اور کرداروں سے اتنی گہری واقفیت بھی کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہوگی۔ اودھ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ''شب گزیدہ'' اودھ کی فیوڈل تہذیب کا المیہ ہے لیکن آزادی سے چار سال قبل اودھ کے تعلقہ دار اور ان کی رعیت محض ٹائپ یا علامتی کردار ہرگز نہیں ہیں بے حد حقیقی اور جیتے جاگتے انسانوں کی انفرادی اور طبقاتی شخصیتوں اور ان کے کربناک سماجی اور جذباتی رشتوں کے حیرت انگیز تنوع اور مٹے ہوئے معاشرے اور انسانی ڈرامے کی بے مثال مصوری ہے۔ ''شب گزیدہ'' کے ایسے ناولٹ اردو میں غالباً نہیں لکھے گئے۔ ''شب گزیدہ'' سے بہتر کہانی قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں۔''

(گفتگو، بمبئی، شمارہ۔1، 1967، ص 353)

آزادی سے قبل اودھ کے مسلمان ظاہری رکھ رکھاؤ، عیش وعشرت، بدمستی اور شراب نوشی وغیرہ میں اس حد تک مبتلا تھے کہ وہ اپنے اصل مقصد اور ریاست کے انتظامات سے بے حد غافل رہتے تھے۔ انھیں تو نہ

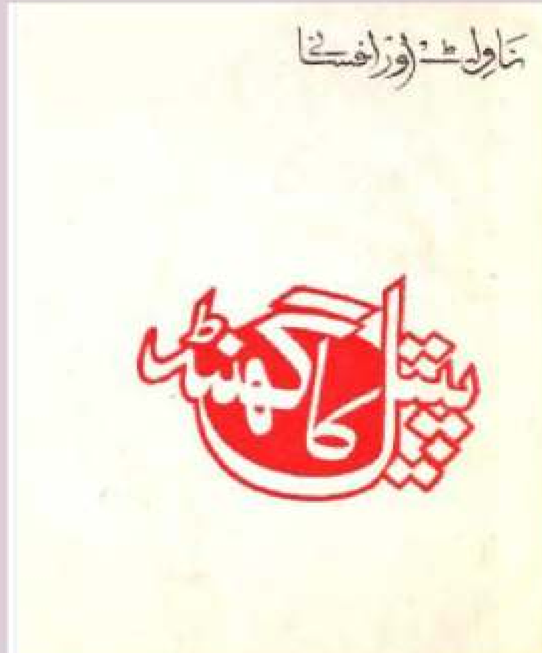

تہذیب اور نئی قدروں کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ ان کے لیے نوکری کرنا ذلت کا باعث تھا کیونکہ وہ زمیندار تھے اور ان کے آبا و اجداد نے کبھی نوکری نہیں کی تھی۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کی حکومت اور زمینداری ازلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ زمانے کے ساتھ چلتے تھے اور نہ ہی اسے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم زمینداروں کے مقابلے میں بھی ان کے اندر عقل و شعور، علم و ہنر، تعلیم و تربیت کی بہت حد تک کمی تھی۔ قاضی عبدالستار کے ناول ''شب گزیدہ'' کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس نقطہ نظر کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے:

''تھوڑی دوری پر میدان میں پہاڑ جیسے جوان لڑکے مخملی ٹوپیاں پہنے ڈنڈوں پر تعویز باندھے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے اور قرآن شریف کی قسمیں کھا رہے تھے اور پھبتیاں کس رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیواروں کے پیچھے مجبور اور محزون مغل آباد کے تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بانس کے گول گول صندوقچے تھے۔ ان میں رفو کیے ہوئے تن زیب کے کرتے، کڑھے ہوئے پلّے اور جامدانی کے ایک آدھ شیروانی دفن تھی۔ یہ نوکری نہیں کر سکتے تھے کیونکہ جاہل تھے، یہ مزدوری نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ ان کے باپ دادا زمیندار تھے اور یہ جام نگر چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس دس بیس بیگھہ زمینوں پر مشتمل زمینداریاں تھیں۔ ان کے لڑکے گلی ڈنڈا کھیلتے تھے اور بڑے سرکار کے ساتھ شکار پر جاتے تھے۔ ان کی عورتیں محرم بنی ہوئی زندگی کے امام باڑوں میں یادِ حسین کے مرثیے پڑھتی تھیں۔ کھجور کی گٹھلیوں کے ساتھ تسبا کو پھانکتی تھیں اور مر جاتی تھیں۔ ان کے بزرگ گڑھی کی تقریبات میں شیروانی پہن کر شرکت کرتے اور کرائے پر مقدمہ لڑتے تھے اور اپنے اجداد کے قصے سناتے تھے۔ مٹی کی شکستہ دیواروں کے اس پار سلوں پر بٹے چلنے لگے تھے اور چھتوں پر دھوئیں کی اوڑھنیاں لہرانے لگیں تھیں۔ آگے چودھرانہ تھا جہاں کاستھ آباد تھے۔ یہاں لپے پُتے مکانوں کے آگے سبک تجل جانور بندھے تھے۔ ان کے طاقوں پر دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں سجی ہوئی رکھی تھیں۔ ان کی عورتیں گوشت کا ''کلیا'' کہتی تھیں۔ پکا لیتی تھیں مگر کھانا پاپ سمجھتی تھیں۔ ان کی لڑکیاں ہندی پڑھتی تھیں اور لڑکے اردو۔ مرد ہل جوتتے تھے قلم کے ساتھ ہتھوڑے اور بسولے بھی چلاتے تھے۔ کہیں آ پڑتی تو سروں پر مریٹھے باندھ کر لاٹھیاں بھی چکا لیتے تھے۔ یہاں کی صاف ستھری سڑکوں پر گزرتے ہوئے راہ گیروں کے چہروں پر زندگی نے مصروفیت اور ذمہ داری کے چراغ جلا رکھے تھے۔''

(قاضی عبدالستار، شب گزیدہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2014، ص 124)

غرض یہ کہ قاضی عبدالستار نے ناول ''شب گزیدہ'' میں جو کچھ بھی لکھا ہے، اس کا تعلق مشرقی یوپی یعنی اودھ کے زمیندرانہ اور جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ سے پیدا ہونے والے مشکلات اور پریشانیوں سے ہے جس کو قاضی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالستار نے چونکہ زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے عروج و زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے وہ اپنے اس ناول کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ مسلمان جن کی سارے ہندوستان میں حکومت ہوا کرتی تھی، اپنے پیروں پر اس نے خود کلہاڑی ماری۔ عیش و عشرت اور دقیانوسی خیالات میں پڑ کر موجودہ صورت حال سے غافل ہو کر اپنی بربادی اور تباہی کا وہ خود ذمہ دار بنا ہے۔

Saba Rahman
Research Scholar
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)

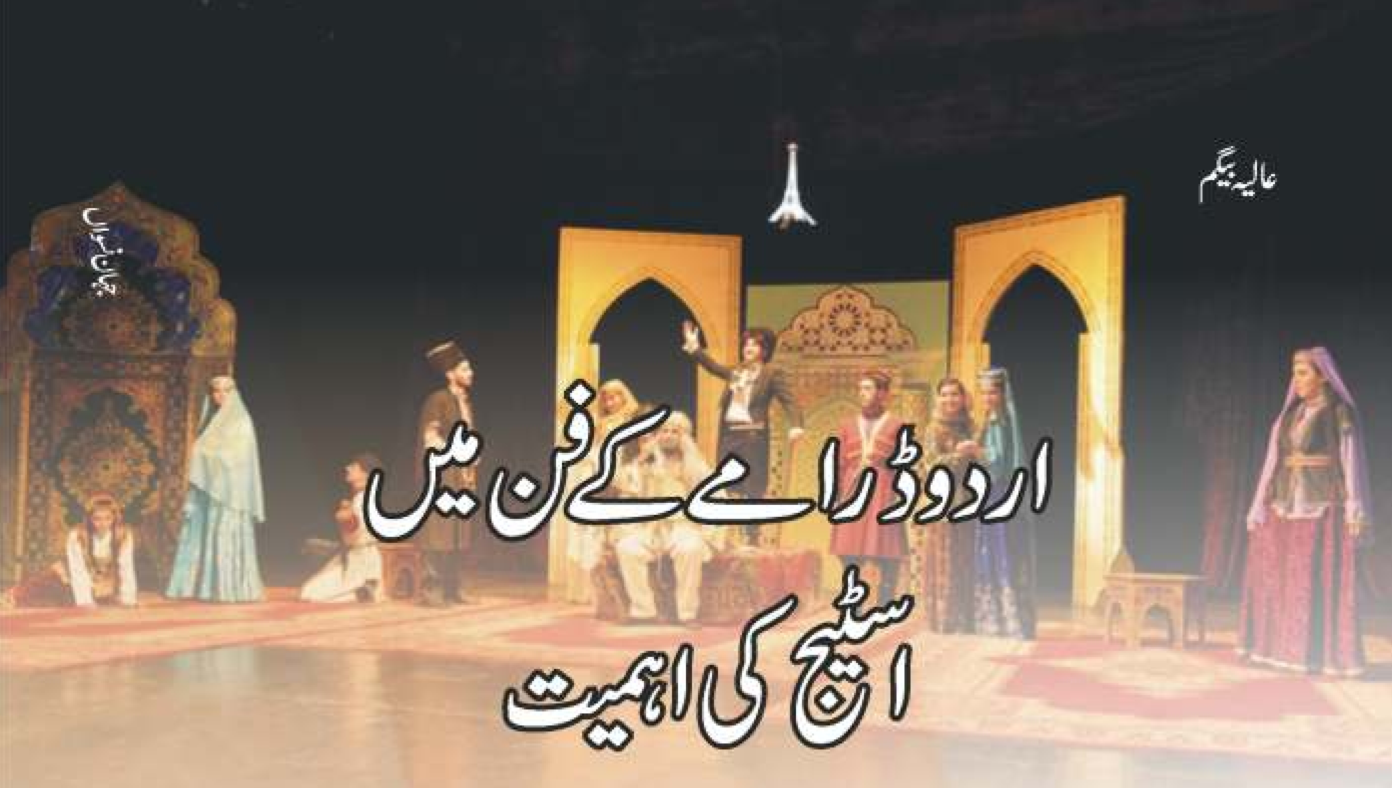

عالیہ بیگم

اردو ڈرامے کے فن میں اسٹیج کی اہمیت

دنیائے ادب کے کسی بھی اصناف کا مکمل مطالعہ کرنا اور اس کے صحیح نتائج اخذ کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس عہد و ماحول (جس عہد میں فن پارہ تخلیق ہوا ہے) کے تہذیبی وتمدنی اور سماجی و معاشرتی حالات وواقعات سے پوری طرح واقفیت نہ حاصل ہو جائے۔ علاوہ ازیں ایک اہم جزو یہ بھی ہوتا ہے کہ اس مخصوص فن سے متعلق روایات اور بدلتے ہوئے جدید رجحانات کو بھی ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہوتا ہے اور اردو ڈرامہ بھی ان اصول وضوابط سے مبرا نہیں۔ اس لیے اردو ڈرامے کا مطالعہ کرتے وقت جہاں ایک طرف ادبی وتہذیبی روایات اور جدید رجحانات کا خصوصی طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے وہیں دوسری جانب اس عہد و ماحول میں اسٹیج کے حالات اور تھیٹر کی ضروریات کو ذہن نشین کرنا اشد ضروری ہوتا ہے۔

ڈرامہ دنیائے ادب کی وہ قدیم ترین صنف ہے، جس میں ڈرامہ نگار انسانی زندگی کے مختلف واقعات و حالات اور حادثات کو کہانی کے پیرائے میں پیش کر کے اپنے افکار و خیالات کو سامعین و ناظرین تک پہنچانے کی مسلسل کوشش کرتا ہے۔ ڈرامے کا آغاز دراصل نقالی سے ہوا ہے اور بقول ارسطو' نقالی انسانی جبلت میں داخل ہوتی ہے اور یہ بچپن سے انسان اور دیگر جانوروں، حیوانوں میں نظر آتی ہے اور اس کی ترقی یافتہ شکل کا نام ہی ڈرامہ ہے۔'

ڈرامے کا لازم وملزوم رشتہ اسٹیج سے ہوتا ہے اور بغیر اسٹیج کے ڈرامے کی تکمیل ممکن نہیں۔ جس طرح تخلیق شعر کی خاطر شاعر چن چن کر لفظوں کا انتخاب کرتا ہے اسی طرح ڈرامہ نگار مختلف النوع اداکاروں کے ذریعہ ڈرامے کی کہانی کو ناظرین کے روبرو پیش کرتا ہے۔ چونکہ صنف ڈرامہ پڑھنے لکھنے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا عمیق تعلق عمل سے ہوتا ہے لہٰذا بغیر عمل کے ڈرامہ ممکن نہیں ہوتا۔ یہ عمل تبھی ممکن ہے جب اسے اسٹیج کیا جاتا ہے۔ بعض دوسری اہم چیزوں کی طرح ڈرامے کے لیے ناظرین کی موجودگی بھی بے حد ضروری ہوتی ہے کیونکہ ڈرامے کی قدر و قیمت اور اس کی کامیابی کا انحصار بڑی حد تک ناظرین وسامعین پر ہوتا ہے۔ محمد اسلم قریشی اپنی کتاب 'اردو ڈرامہ نگاری کا فن' میں ڈرامے کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈرامہ اسٹیج پر فطرت کی نقالی کا نام ہے، جس میں اداکاروں کے ذریعہ زندگی کے غیر معمولی اور غیر متوقع حالات کے عمل میں 'قوت ارادی' کا مظاہرہ تماشائیوں کے روبرو ایک معین وقت اور مخصوص انداز میں کیا جاتا ہے۔''

(محمد اسلم قریشی۔ اردو ڈرامہ نگاری کا فن، ص، 22)

اسی طرح اردو کے مشہور و معروف ڈرامہ نگار اور نقاد ابراہیم یوسف ڈرامے میں اسٹیج کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

> ''ڈرامہ یا ناٹک کی اہمیت جو اس کو دیگر اصناف ادب سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی عوام سے قربت ہے کیونکہ جب ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا ہے تو اس کا دیکھنے والا کوئی مخصوص طبقہ نہیں

بلکہ سوسائٹی کے ہر طبقے کے افراد اس میں شامل ہوتے ہیں"

محمد حسن کے الفاظ میں:

"ڈرامہ محض ادبی تصنیف نہیں ہے اس کا تعلق اسٹیج سے ہے اور جب تک اسٹیج کی روایت زندہ نہ ہو اس وقت تک ڈرامے کی تخلیق ممکن نہ تھی۔ اسٹیج کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے۔ ان میں موسیقی، اداکاری، رقص اور آرائش و زیبائش خواہ وہ اسٹیج کی ہو یا فن کاری کی، سبھی لازمی جزو کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ فنون ایک دوسرے سے منسلک و مربوط ہیں، لازمی طور پر ان کا تعلق مربوط اور ہم آہنگ سماج سے ہے۔"

(محمد حسن، ادبی سماجیات، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔ دسمبر 1983، ص 83)

اس طرح ڈرامہ اس صنف کا نام ہے جس میں تخلیق کار اپنے افکار و خیالات کو اپنی تمام تر فکری و ذہنی صلاحیتوں کے ذریعہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف واقعات و حادثات کو کہانی کے پیرائے میں ڈھال کر ایک مسلسل طریقے سے ربط و تسلسل کے ساتھ جوڑتا اور سنوارتا ہے تاکہ وہ قصہ یا کہانی حقیقت معلوم ہونے لگے اور پھر اسے عملی طور پر باقاعدہ اسٹیج پر اداکاروں کے ذریعے مکالموں یا اشاروں میں ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

بہر حال ان تمام تعریفوں کے مطالعہ سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ ڈرامے کا تعلق بنیادی طور پر اسٹیج کے ساتھ ہے اور ڈرامہ اور اسٹیج ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں، ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھا جانا چاہیے کیونکہ ڈرامہ ہے تو اسٹیج ہے اور اسٹیج ہوگا تبھی ڈرامہ مکمل ہوگا۔ یعنی ڈرامہ عملی طور پر اسٹیج کیا جانا بے حد ضروری ہوتا ہے اسٹیج ہونے کے بعد ہی ڈرامہ مکمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ محمد حسن نے ڈرامے اور اسٹیج کے متعلق لکھا ہے کہ:

"ڈرامہ محض ادبی تصنیف نہیں کیونکہ اس کا اسٹیج کیا جانا لازمی جزو ہے اور اگر اسٹیج کی روایت کا وجود ختم ہونے لگے تو ڈرامے کی تخلیق ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔"

ارسطو نے بھی بوطیقا میں ڈرامے کے فن سے متعلق جو تین وحدتیں بتائی ہیں (وحدت زماں، وحدت مکاں اور وحدت عمل) ان میں سب سے زیادہ ذکر وحدت عمل پر ہی کیا گیا ہے، اور وحدت عمل کو ارسطو نے ڈرامے کی تکمیل کے لیے لازمی جزو قرار دیا ہے۔ یہ وحدت عمل دراصل اسٹیج کی ہی صورت ہے۔ اسٹیج درحقیقت وہ کسوٹی ہے جس پر ڈرامے کو پرکھا جاتا ہے، جو کہ ایک پیچیدہ عمل ہے اور اسی پر ڈرامے کی کامیابی اور ناکامی منحصر ہوتی ہے کیونکہ جب ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا ہے تو اس کی تمام خوبیاں اور خامیاں سب کے سامنے ظاہر ہو جاتی ہیں اس لیے کوئی بھی ڈرامہ کامیاب ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب اس ڈرامے کو اسٹیج کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ عمل اور مشکل ذریعہ اظہار ہے۔ اسٹیج کی تکمیل کے لیے جن اہم لوازم کی ضرورت ہوتی ہے ان میں ہدایت کار، روشنی، موسیقی اور اداکار وغیرہ کے ساتھ تماشائیوں کا ہونا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔ بغیر تماشبین کے کوئی بھی ڈرامہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس طرح اسٹیج کے ساتھ اردو ڈرامے کی گہری وابستگی رہی ہے۔

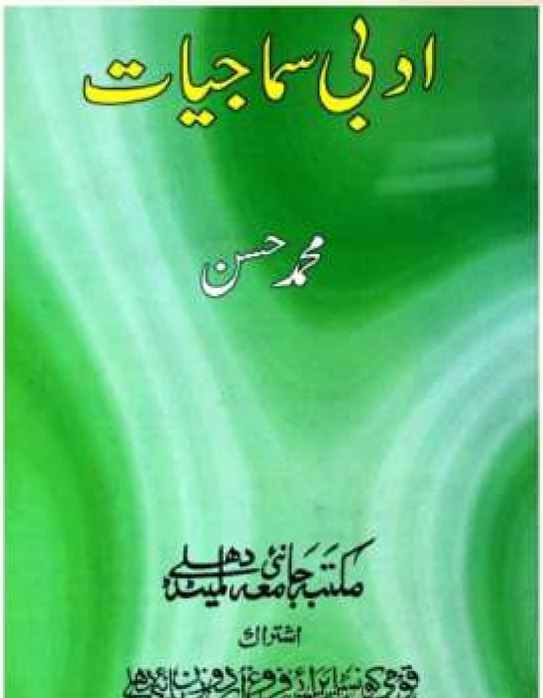

ڈرامہ واحد ایسی صنف ہے جس میں قصہ یا کہانی کے ساتھ براہ راست دیگر فنون لطیفہ مثلاً رقص، موسیقی، مصوری اور اداکاری وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں اور یہ ڈرامے کی خوبی بھی جاسکتی ہے کہ ان تمام فنون لطیفہ سے ہم ایک ہی جگہ پر بیک وقت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ڈرامے میں اسٹیج کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"ڈرامے کی اصلی جگہ اسٹیج ہے اور دیکھنے والے جب زندہ کرداروں کو اپنی آنکھوں سے اسٹیج پر عمل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ریڈیو پر سننے یا فلم ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے کہیں زیادہ اثر قبول کرتے ہیں۔"

یعنی ڈرامہ صرف تحیر کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں

ڈرامہ تبھی مکمل ہوتا ہے جب اسے اسٹیج کے لوازمات اور دیگر ضروریات کو مدنظر رکھ کر تیار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری اسٹیج کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جس عمارت کو ہم تھیٹر مانتے ہیں، اس میں ڈرامہ کھیلنے کے لیے ایک بڑا ہال ہوتا ہے۔ ہال کے سامنے بالائی سطح پر ایک جگہ ہوتی ہے، جہاں اداکار ڈرامہ کھیلتے ہیں۔ اس جگہ کو اسٹیج کہتے ہیں۔ بالائی سطح اس لیے ہوتی ہے تاکہ پیش ہو رہے ڈرامے کے کردار تماشبین کو نظر آسکیں گے، ناظرین اور کرداروں کے درمیان ایک فرق بھی ہوتا ہے، کیونکہ ڈرامہ کھیلتے وقت اداکاروں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ تھیٹر میں اسٹیج چونکہ تعمیر شدہ ہوتا ہے اور ایک مستقل جگہ ہوتی ہے۔ اب اگر کھلی جگہ میں ڈرامہ کھیلنا مقصود ہو تو ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے کسی میدان یا کھلی جگہ پر لکڑیوں یا باقی چیزوں سے یہ آدھ ایک گھنٹے میں تیار ہو جاتا ہے۔''

(ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، رسالہ آج کل شمارہ نمبر: مضمون: ص۔11)

ڈرامے کے اولین قوانین وضوابط جو یونان میں ارسطو اور ہندوستان میں بھرت منی نے قائم کیے تھے ان تمام اصول وضوابط کو ایک عرصہ دراز تک ڈرامہ نگاروں نے سختی سے مانا اور اس پر عمل پیرا رہے لیکن بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ ڈرامے کے رجحان میں بھی کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی اور انگریزی کے مقبول ومشہور ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیر اور بعض دوسرے لوگوں نے ان قدیم اصولوں سے انحراف کیا اور اپنے لیے کچھ آزادی اختیار کر کے اس صنف کو ایک نئی سمت ایک نیا وقار بخشا۔ نتیجتاً آج یہ صنف بڑی حد تک آزاد تو ہے لیکن اس میں ہمیشہ سے عوام کی ضرورت کا خاص خیال رکھا جاتا رہا ہے۔

ڈرامہ چونکہ پیش کیا جانے والا فن پارہ ہے لہٰذا اس کو مختلف النوع میڈیم کے ذریعہ عوام تک پہنچا کر فنکار کی کیفیت اور اس کے جذبات و احساسات کو بہ آسانی عوام کے دل و دماغ تک منتقل کیا جا سکتا ہے۔ معروف ڈرامہ نقاد نقول نے ڈرامہ اور تھیٹر کے رشتے کو لازم وملزوم قرار دیا ہے۔ اس موضوع پر بہت سے ادیب ودانشوروں نے خامہ فرسائی کی، کچھ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ڈرامے کا رشتہ تھیٹر سے ہے نہ کہ ادب سے۔ بہر حال ڈرامہ اور تھیٹر کے رشتہ سے قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ڈرامے کو ادب سے پوری طرح خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یوں تو آج کل ڈرامے کی بہت سی اصناف وجود میں آ گئی ہیں لیکن اصل میں ڈرامہ وہی کہلاتا ہے جو اسٹیج کے لیے لکھا گیا ہو۔

ہندوستان میں ڈرامے اور اسٹیج کی روایت اور اس کی تاریخ بہت قدیم ہے لیکن جہاں تک اردو ڈرامے اور اسٹیج کی تاریخ کی بات ہے تو اس کی عمر محض ڈیڑھ یا دو صدی کے قریب ہی پہنچی ہے۔ اس مختصر سے وقفے میں اردو میں معتدد کلاسیکی اور جدید ڈرامے لکھے گئے۔ ابتدائی دور میں جو ڈرامے لکھے گئے وہ بھانڈوں کی نقالی، عشقیہ لوک کھیل، اسلامی جنگ نامہ، رام لیلا، کرشن لیلا، نوٹنکی اور سوانگ وغیرہ کی شکل میں مذہبی رنگ لیے ہوئے ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس نے ارتقائی مدارج طے کیے اور باقاعدہ ڈرامے کی شکل میں نمودار ہوئے۔ خصوصی طور پر نوٹنکی کا فن اردو ڈرامے اور تھیٹر کی ترقی میں معاون ثابت ہوا۔ ہندوستان میں اردو ڈرامہ اور اسٹیج کو نواب واجد علی شاہ کے زمانے سے ترقی اور عروج حاصل ہوا۔ نواب اودھ واجد علی شاہ اردو ڈرامہ اور اسٹیج کے بانی کہے جاتے ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کو اردو کا پہلا ڈرامہ نگار قرار دیتے ہیں۔ بقول پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب:

''واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو ڈرامے کا وجود نہ تھا۔ اس اہم صنف ادب کی بنیاد ڈالنے کا فخر ان کے لیے اٹھ رہا تھا۔ انھوں نے ولی عہد کے دنوں میں ''رادھا کنھیا'' کی داستان محبت پر مبنی ایک چھوٹا سا ڈرامہ لکھا جو ہماری خوش قسمتی ہے کہ اب تک موجود ہے فنی اعتبار سے اس کا درجہ کچھ بھی ہو اردو کا پہلا ڈرامہ ہونے کی حیثیت میں وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔''

(پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، نظامی پریس لکھنؤ 1968، ص:23)

واجد علی شاہ سے لے کر آغا حشر کاشمیری تک کے اردو ڈرامے اور اسٹیج کا مطالعہ کرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دور اردو ڈرامہ اور اسٹیج کے لیے دور زریں ثابت ہوا۔ اس دور میں اردو ڈرامے اور اسٹیج نے بہت ترقی اور کامیابی حاصل کی۔ بمبئی میں اسٹیج کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے ڈرامے کو خواص کی محفلوں سے نکال کر عوام تک پہنچا دیا اور اس فن میں عوام کی بڑھتی دلچسپی اور ذوق وشوق کے باعث اس نے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے خوب شہرت حاصل کی۔ بمبئی میں تھیٹر کی کامیابی کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں بھی ڈرامہ کھیلنے کا یہ سلسلہ عام ہو گیا۔ اس وقت سفر کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا اسٹیج اور اس کے لوازم تیار کیے جاتے تھے جنھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ بہ آسانی منتقل کیا جا سکے۔ حالانکہ اس وجہ سے وہ تمام ساز وسامان جنھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر لے جایا جاتا تھا ان میں تخفیف ہو گئی۔ بہر حال ان تمام مشکلوں اور پریشانیوں کے باوجود

بھی ہندوستان کا گوشہ گوشہ ڈرامے کے فن سے روشناس ہو گیا۔ ڈرامے کی بڑھتی مقبولیت اور ترقی بہت سی ڈرامہ کمپنیوں کو عمل میں لائی، ان کمپنیوں نے ڈرامے کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ان کمپنیوں نے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی غرض سے جہاں ایک طرف اسٹیج کے لوازمات کو زیادہ سے زیادہ مزین کیا وہیں دوسری جانب نئے نئے ڈراموں کو پیش کرنے کی سعی کی۔ اس جدوجہد کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے تجارت کے مقاصد کو پیش نظر رکھ کر عوام کو خوش کرنے اور ان کی دلچسپی کو مزید بڑھانے کی غرض سے پیہم کوششیں جاری رکھیں اور اس طرح عوام کے ذوق وشوق کی تشفی کو اپنا نصب العین قرار دے کر ڈرامہ نگاری کے فن کو فراموش کر دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں سیاسی، سماجی و معاشرتی بیداری پیدا ہونے لگی جس کے باعث اردو ادب نے ایک نیا موڑ لیا اور لوگوں میں ایک نیا شعور بیدار ہوا جس نے فن ڈرامہ کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ آغا حشر کاشمیری کے آخری دور میں جو اردو ڈرامے پیش کیے جا رہے تھے وہ معاشرتی مسائل کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تکنیکی اعتبار سے دیکھا جائے تو چند ڈراموں کے علاوہ زیادہ تر ڈرامے ایک ہی روپ اور ایک ہی روش اختیار کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دور کے ڈراموں کی تکنیک میں جو اصول کارفرما ہے اور جو بھی خوبیاں اور خامیاں اس دور کے ڈراموں میں نظر آتی ہیں وہ دراصل اسی ایک عنصر کی پروردہ ہیں کہ کمپنیوں کو عوامی مذاق کی تشفی منظور تھی۔ کمپنیوں کے ذاتی مفاد کے باعث ڈرامہ ایک عامیانہ چیز بن کر رہ گئی اور اس کی ترقی کی راہیں تنگ ہونے لگی لیکن جب ہم فن ڈرامہ کا بہ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو علم ہوتا ہے کہ ڈرامے کا عامیانہ ہونا ایک حد تک معیوب نہیں ہوتا کیونکہ جس طرح ڈرامہ نگار اسٹیج کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتا اسی طرح وہ تماشائیوں کے تقاضوں سے بھی منہ نہیں موڑ سکتا۔ لہٰذا ان حدود کو متعین کرنا فنکار کے لیے لازمی ہے۔

آغا حشر کاشمیری کے بعد سے امتیاز علی تاج تک کے دور میں لکھے گئے اردو ڈرامے پر نظر ڈالے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ڈرامے کا ایسا دور تھا جب اردو ڈرامے تو بہ کثرت لکھے گئے لیکن وہ اسٹیج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ ان ڈراموں میں ادبیت اور حسن کاری تو نظر آتی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں مقصدیت کا عنصر اس قدر حاوی رہا ہے کہ جس کے باعث ان ڈراموں کی اہمیت کم ہو گئی۔ تھیٹر اور اسٹیج سے قطع نظر دیکھا جائے تو ادبی ڈرامے بھی اپنی حیثیت رکھتے ہیں لیکن چونکہ بغیر اسٹیج کے ڈرامے کی تکمیل ممکن نہیں اس لیے یہ ڈرامے کامیاب نہیں ہوئے۔ اردو میں ادبی ڈراموں کا آغاز محمد حسین آزاد کی تمثیل 'اکبر' سے ہوتا ہے۔ اس انداز کو فروغ دینے والے وہ لوگ تھے جنھوں نے ڈرامے کو سنجیدہ طرز کی ادبی صنف مانا اور اسے تجارتی تھیٹر کے ابتذال کی حدوں سے اٹھانا چاہا۔ ان ادبی ڈرامہ نگاروں میں محمد حسین آزاد کے ساتھ مرزا محمد ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر، عبدالماجد دریابادی، پنڈت دتاتریا کیفی، پریم چند اور برج نرائن چکبست وغیرہ کے نام بھی خصوصی طور پر شامل ہیں۔ ان ادبی ڈراموں میں خواہ وہ محمد حسین آزاد کا ڈرامہ اکبر ہو یا بعض دوسرے ڈرامہ نگار کے ڈرامے مثلاً راج دلاری، کملا، شہید وفا، مرقع لیلیٰ مجنوں، زود پشیماں یا پھر پریم چند کا ڈرامہ کربلا یہ تمام ہی ڈرامے ادبی لحاظ سے خاص حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس طرح سے ناول اور داستان تو مکمل ہو سکتی ہے مگر ڈرامہ نہیں کیونکہ ڈرامے کے لیے اسٹیج کا شعور ہونا چاہیے۔ بقول عطیہ نشاط:

> "ادبی ڈرامے چونکہ مروجہ اسٹیج سے غیر متعلق تھے اس لیے ان پر روایتوں کی پابندی لازمی نہیں تھی جو اس وقت کے ڈراموں کا خاصہ بن گئی تھیں۔ مرقع لیلیٰ مجنوں اور زود پشیماں وغیرہ کے دیباچوں سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مقصد ڈرامہ نگاری کے مروجہ طریقوں کو بدلنا اور اس میں اصلاح کرنا ہے۔"

(ڈاکٹر عطیہ نشاط۔ اردو ڈرامہ روایت اور تجربہ۔ نیشنل آرٹ پریس، الہ آباد 1973 ص:221)

بہر حال ڈرامے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اسٹیج سے اس کا تعلق بے حد ضروری ہے۔ فنی اعتبار سے یہ تمام ڈرامے ناقص ٹھہرتے ہیں۔ اسے

اردو ڈرامے کی بدنصیبی ہی کہی جاسکتی ہے کہ ایسے بڑے فنکار جنھیں ارسطو کی بوطیقا سے پوری طرح واقفیت حاصل تھی اور ڈرامے کے فن اور اس کے لوازمات سے بخوبی آشنا ہوتے ہوئے بھی ڈرامے کے فن کو اسٹیج سے الگ کر کے ان اصولوں سے انحراف کر، اردو ڈرامے لکھے اور ان سب کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔

البتہ امتیاز علی تاج کے بعد اردو ڈرامہ اور اسٹیج کی تاریخ میں ایک ایسا دور آیا جسے اردو ڈرامے کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس دور کے زیادہ تر اردو ڈرامے اسٹیج کے لوازمات اور ناظرین کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر لکھے گئے۔ ان میں سے بیشتر ڈراموں کو اسکولوں اور کالجوں میں اسٹیج کیا گیا اور وہ اسٹیج کی کسوٹی پر کھرے اتر کر کامیاب ہوئے۔ اس دور کے ڈرامہ نگاروں میں خصوصی طور پر پروفیسر محمد مجیب، سید عابد حسین، پروفیسر اشتیاق حسین قریشی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے اردو ڈرامہ اور اسٹیج کے تعلق سے انتہائی اہم کام سرانجام دیے۔

ترقی پسند اور اپٹا کے زیر اثر جو اردو ڈرامے لکھے گئے اس نے اردو ڈرامہ اور اسٹیج کی ترقی اور کامیابی کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ اپٹا کی مختلف شاخیں جو پورے ملک میں پھیل چکی تھیں اس نے ہندوستان کے الگ الگ شہروں میں لاتعداد اردو ڈرامے پیش کیے اور ڈرامے کی تکنیک میں نئے نئے تجربات کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس ضمن میں خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر محمد حسن، اپندر ناتھ اشک، حیات اللہ انصاری، پرکاش پنڈت، حبیب تنویر، ریوتی سرن شرما، ہاجرہ مسرور، مرزا ادیب، کرتار سنگھ دگل وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں جنھوں نے اردو ڈرامہ اور اسٹیج کو ایک نئی سمت اور ایک نئی بلندی اور وقار بخشا۔

آزادی کے بعد لکھے گئے اردو ڈرامے اور اسٹیج پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گزرے 70 برسوں میں تعداد کے اعتبار سے ان ڈراموں کی گنتی کم ہے لیکن مواد اور معیار کے لحاظ سے یہ ڈرامے بہتر دکھائی دیتے ہیں۔ آزادیٔ ہند کے ساتھ ہی ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہوگیا جس کے نتیجے میں پورے ملک میں ظلم و بربریت اور فسادات کا بازار گرم ہوگیا اور انسان انسان کا دشمن نظر آنے لگا ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اردو ڈرامہ اور اسٹیج نے عملی طور پر امن و آشتی کا پیغام عوام تک پہنچانے کی کوششیں کیں۔

عصر حاضر میں بھی اس صنف پر کام ہو رہا ہے خواہ وہ ڈرامے کی تنقید و تاریخ کے متعلق کام ہو یا فن ڈرامہ نگاری پر، اس پر مختلف فنکاروں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ اردو کے جدید ڈرامہ نگار اور ڈرامہ نقادوں میں نور الٰہی محمد عمر، بادشاہ حسین، ڈاکٹر عطیہ نشاط، ڈاکٹر اخلاق اثر، عشرت رحمانی، ڈاکٹر انجمن آرا انجم، ڈاکٹر محمد حسن، ابراہیم یوسف، ڈاکٹر شمیم حنفی، اسلم قریشی، ڈاکٹر ظہور الدین، اشفاق احمد، ڈاکٹر زاہدہ زیدی، ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر اعظم ہاشمی وغیرہ کے کام خصوصی توجہ کے حامل ہیں۔

بہرحال آج بدلتے وقت کے ساتھ ڈرامے اور اسٹیج کے لوازمات میں بھی بہت اہم تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ پہلے کی مناسبت میں آج کے ڈرامہ اور اسٹیج میں بہت فرق آیا ہے۔ آج کل ڈرامے اور اسٹیج کے لیے نئی نئی تکنیک اور سائنسی مشینوں کا بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ آج جہاں ایک طرف آڈیٹوریم نئے نئے انداز سے بنائے جاتے ہیں اور سیٹوں کو بھی اس ترتیب سے لگایا جاتا ہے کہ ناظرین کو دیکھنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے وہیں دوسری جانب الگ الگ کلاسیز کی سیٹس بھی ملتی ہیں۔ پہلے جہاں اسٹیج پر اداکاروں کی زیبائش اور سجاوٹ وغیرہ پر بہت زور دیا جاتا تھا آج اس میں بہت حد تک کمی آگئی ہے۔ آج ڈرامہ ایک عام اسٹیج پر بغیر کسی مخصوص میک اپ کے ایک ہی رنگ کا معمولی لباس پہن کر بھی کھیلے جا رہے ہیں اب اسے بجٹ کی کمی سمجھے یا وقت کی ضرورت یا پھر اسٹیج کے نئے تقاضے۔ بہرکیف اس آزادی سے اسٹیج اور ڈرامے کا رشتہ بڑھا اور مضبوط ہوا ہے ورنہ آج کے دور میں اسٹیج کی تکنیکی وفنی پابندیاں ڈرامے اور اسٹیج کے رشتے کو کمزور کردیتی۔

اسٹیج درحقیقت ڈرامے کو پرکھنے کی کسوٹی ہوتا ہے جو ڈرامے کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ اسٹیج ہی وہ ذریعۂ اظہار ہے جس کے ذریعے ڈرامہ عوام تک پہنچتا ہے اور مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ ڈرامہ پڑھنے سے کہیں زیادہ دیکھنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ تخلیق کار ڈرامے کے ذریعے سے جو پیغام عوام تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے وہ پیغام ناظرین کے ذہن تک بآسانی منتقل ہو جاتا ہے جب کہ ڈرامے کے قاری کو بعض اوقات اس میں مزید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ادبی ڈراموں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ان کا اسٹیج سے غیر متعلق ہونا تھا چونکہ تخلیق کار کے افکار و خیالات اور اس کے سماجی پیغام کی رسائی عوام تک اسٹیج کے ذریعہ ہی ممکن ہے اس لیے ڈرامے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اسٹیج سے اس کا تعلق اشد ضروری ہے۔ اس لیے وہ ڈرامہ جو اسٹیج کے لوازمات کو پورا نہ کرے بقول فصیح احمد اسے کچھ بھی کہا جائے لیکن ڈرامہ نہیں کہا جاسکتا۔ ☐☐☐

Aliya Begum
Research Scholar
Department of Urdu
University of Allahabad
Prayagraj- 211002 (U.P)

ڈاکٹر شگفتہ یاسمین

ادبی کوئز

(1) ان میں سے کون سا قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول ہے؟

(الف) کارِ جہاں دراز ہے (ب) چاندنی بیگم

(ج) آخر شب کے ہم سفر (د) گردش رنگ چمن میں

(2) وارث علوی نے ان میں سے کون سی کتاب حالی کی تنقید پر لکھی ہے؟

(الف) حالی مقدمہ اور ہم (ب) دو حالی

(ج) حالی کا نیا تنقیدی شعور (د) حالی کے شعری نظریات

(3) فیض کس انگریزی رسالے کے مدیر تھے؟

(الف) کامریڈ (ب) ہندوستان ٹائمز

(ج) دی ہندو (د) پاکستان ٹائمز

(4) اردو کا پہلا ٹائپ شدہ اخبار کون سا تھا؟

(الف) عصمت (ب) تمدن

(ج) کامریڈ (د) ہمدرد

(5) عصمت چغتائی کے یہاں کس کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں؟

(الف) ٹالسٹائی (ب) افلاطون

(ج) فرائڈ (د) ایڈلر

(6) ان میں سے کون سی تصنیف مولوی کریم الدین کی ہے؟

(الف) خط تقدیر (ب) گلابی اردو

(ج) کرم دھرم (د) کایا پلٹ

(7) یوسف خاں کمبل پوش کے سفر نامہ کی نشاندہی کیجیے؟

(الف) ساحل اور سمندر (ب) شریف زادہ

(ج) خونی دنیا (د) عجائبات فرنگ

(8) مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ سے قبل کون سا رسالہ نکالا تھا؟

(الف) لسان الصدق (ب) ہمدم

(ج) زمین (د) امکان

(9) بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ اثر لکھنوی نے کس نام سے کیا ہے؟

(الف) ندائے خداوندی (ب) ذکر خداوندی

(ج) نغمہ خداوندی (د) رمز خداوندی

(10) ''عدل جہانگیر'' کا خالق کون ہے؟

(الف) حالی (ب) آزاد

(ج) اقبال (د) شبلی

(11) ''ماہ تمام'' کس شاعرہ کا کلیات ہے؟

(الف) کشور ناہید (ب) زاہدہ زیدی

(ج) پروین شاکر (د) فاطمہ نقوی

(12) ''سلسبیل'' آل احمد سرور کی تصنیف ہے اس کا تعلق کس صنف سے ہے؟

(الف) افسانہ (ب) ناول

(ج) شاعری (د) تنقید

(13) ''انوار سہیلی'' کا ترجمہ میر امن نے کیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے؟

(الف) باغ و بہار (ب) طوطا کہانی

(ج) گنج خوبی (د) دیوان جہاں

(14) ''روپ'' کے خالق فراق گورکھپوری ہیں۔ اس کا تعلق کس صنف سے ہے؟
(الف) غزل (ب) نظم
(ج) ناول (د) رباعی

(15) ''مصورِ فطرت'' کسے کہا جاتا ہے؟
(الف) نظیر (ب) اقبال
(ج) فیض (د) خواجہ حسن نظامی

(16) ''آپ بیتی پاپ بیتی'' کس کی خودنوشت ہے؟
(الف) وارث علوی (ب) عصمت
(ج) کشور ناہید (د) ساقی فاروقی

(17) ''رموز السالکین'' کے مصنف امین الدین اعلیٰ کس کے فرزند تھے؟
(الف) میراں جی (ب) نصرتی
(ج) خواجہ بندہ نواز (د) برہان الدین جانم

(18) ابن نشاطی کی تصنیف ''پھول بن'' فارسی کی کس تصنیف پر مبنی ہے؟
(الف) قابوس نامہ (ب) کلیلہ دمنہ
(ج) بساتین (د) چار مقالہ

(19) جعفر زٹلی کس عہد کے شاعر ہیں؟
(الف) بابر (ب) ہمایوں
(ج) اکبر (د) اورنگ زیب

(20) ''کبریائی'' کی تالیف وترتیب کس شاعر نے کی ہے؟
(الف) اقبال (ب) فیض
(ج) مجاز (د) سردار جعفری

(21) ''خواب جہانگیر'' نظم کس کی ہے؟
(الف) فیض (ب) اقبال
(ج) حفیظ جالندھری (د) تلوک چند محروم

(22) ''اقبال حرف ومعنی'' کس کی تنقیدی تصنیف ہے؟
(الف) جگن ناتھ آزاد (ب) ظ۔ انصاری
(ج) اسلوب احمد انصاری (د) سردار جعفری

(23) ''فاؤسٹ'' کس کی تخلیق ہے؟
(الف) گوئٹے (ب) کولرج
(ج) فرائڈ (د) افلاطون

(24) ''انسان اور آدمی'' کس کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے؟
(الف) سردار جعفری (ب) احتشام حسین
(ج) آل احمد سرور (د) محمد حسن عسکری

(25) ''رسیدی ٹکٹ'' کس کی خودنوشت ہے؟
(الف) امرتا پریتم (ب) کشور ناہید
(ج) جیلانی بانو (د) عصمت چغتائی

(26) چکبست کی حیثیت کس نوع کی شاعری سے قائم ہوتی ہے؟
(الف) رومانی (ب) اصلاحی
(ج) قومی ووطنی (د) جمالیاتی

(27) ''مراۃ الغیب'' امیر مینائی کا کیا ہے؟
(الف) دیوان (ب) تصوف پر مشتمل کتاب
(ج) تنقیدی مجموعہ (د) غزلوں کا مجموعہ

(28) ''لبیک'' ممتاز مفتی کی تصنیف ہے۔ اس کا تعلق کس صنف سے ہے؟
(الف) ناول (ب) افسانہ
(ج) خودنوشت (د) سفرنامہ

(29) ''کوئلے کی کان'' سے متعلقہ مسائل پر لکھا گیا ناول ہے؟
(الف) راجہ گدھ (ب) انقلاب
(ج) شکست (د) فائر ایریا

(30) ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' کس کا افسانہ ہے؟
(الف) عصمت (ب) جیلانی بانو
(ج) قرۃ العین حیدر (د) جمیلہ ہاشمی

(31) ''چارپائی'' انشائیہ کا خالق کون ہے؟
(الف) پطرس بخاری (ب) عبدالحق
(ج) کرشن چندر (د) رشید احمد صدیقی

(32) ''نرگس دت'' کا خاکہ کس نے لکھا ہے؟
(الف) بیدی (ب) منٹو
(ج) عبدالحق (د) کرشن چندر

(33) ''روپیہ آنہ اور پائی'' کس کا مشہور افسانہ ہے؟
(الف) بیدی (ب) پریم چند
(ج) منٹو (د) خواجہ احمد عباس

(34) احتشام حسین نے لسانیات وتاریخ پر کون سی کتاب لکھی ہے؟
(الف) روایت اور بغاوت (ب) عکس اور آئینے
(ج) ذوق ادب وشعور (د) ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

(35) ''کہانی کے پانچ رنگ'' کا تعلق فکشن تنقید سے ہے اس کے مصنف ہیں؟

(الف) وارث علوی (ب) محمد حسین
(ج) وقار عظیم (د) شمیم حنفی

(36) ''علامتوں کا زوال'' انتظار حسین کی تصنیف ہے۔ اس کا تعلق کس صنف سے ہے؟

(الف) افسانہ (ب) تنقید
(ج) انشائیہ (د) ناول

(37) ''جام جم'' کس زبان میں لکھی ہوئی سرسید کی تصنیف ہے؟

(الف) فارسی (ب) عربی
(ج) ترکی (د) اردو

(38) محمد حسین آزاد کے نامکمل ڈرامہ ''اکبر'' کو کس ادیب نے پورا کیا؟

(الف) ناصر کاظمی (ب) ناصر فاروقی
(ج) نذیر بنارسی (د) ناصر عباس

(39) قطب شاہی دور کا آخری بادشاہ کون تھا؟

(الف) عبداللہ قطب شاہ (ب) محمد قطب شاہ
(ج) ابوالحسن تانا شاہ (د) ابراہیم قطب شاہ

(40) ''آسماں محراب'' کس ناقد کا شعری مجموعہ ہے؟

(الف) احتشام حسین (ب) آل احمد سرور
(ج) سردار جعفری (د) شمس الرحمٰن فاروقی

(41) ''جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے۔'' کس کا قول ہے؟

(الف) احتشام حسین (ب) سردار جعفری
(ج) کلیم الدین احمد (د) وحید اختر

(42) ''مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے'' کس کا قول ہے؟

(الف) فیض (ب) اقبال
(ج) نظیر (د) فانی بدایونی

(43) گوپال کرشن گوکھلے کا مرثیہ کس نے لکھا ہے؟

(الف) حالی (ب) آزاد
(ج) شبلی (د) چکبست

(44) تمثیلی اعتبار سے کس تصنیف کی شناخت قائم ہے؟

(الف) پھول بن (ب) قطب مشتری
(ج) علی نامہ (د) سب رس

(45) ''لغات کشوری'' کے مولف ہیں؟

(الف) امیر مینائی (ب) مولوی تصدق حسین
(ج) شاہ رفیع الدین (د) فیروز

(46) قرآن شریف کا اردو ترجمہ سب سے پہلے کس نے کیا؟

(الف) شیخ اکرام (ب) شاہ رفیع الدین
(ج) فیض (د) اقبال

(47) ''شعر شور انگیز'' کا تعلق کس شاعر کے اشعار کی تعبیر و شرح سے ہے؟

(الف) درد (ب) فیض
(ج) غالب (د) میر

(48) خمریات کا امام کس کو کہا گیا ہے؟

(الف) غالب (ب) جوش
(ج) جگر (د) ریاض

(49) ''بری عورت کی کتھا'' کس شاعرہ کی خودنوشت ہے؟

(الف) پروین شاکر (ب) کشور ناہید
(ج) جمیلہ ہاشمی (د) عصمت چغتائی

(50) ''ہم نفسان رفتہ'' رشید احمد صدیقی کی تصنیف ہے اس کا تعلق کس صنف سے ہے؟

(الف) خاکہ (ب) ڈرامہ
(ج) انشائیہ (د) غزل

جوابات:

(1) الف (2) الف (3) د (4) د (5) ج (6) الف (7) د (8) الف (9) ب (10) د (11) ج (12) ج (13) ج (14) د (15) د (16) د (17) د (18) ج (19) د (20) د (21) د (22) ج (23) الف (24) د (25) الف (26) ج (27) الف (28) د (29) د (30) ج (31) د (32) ب (33) د (34) د (35) د (36) ب (37) الف (38) ب (39) ج (40) د (41) د (42) الف (43) د (44) د (45) ب (46) ب (47) د (48) د (49) ب (50) الف

□□□

Dr. Shagufta Yasmeen
Chand Manzil, Ashiyana Colony
Road No.5 Sanchi Pati
Hajipur-844101 (Bihar)

خواجہ عبدالمنتقم

خواتین کی تعلیمی پسماندگی

ملکی وعالمی پیمانے پر کیے جانے والی مختلف قانونی وسماجی اصلاحات کے باوجود خواتین آج بھی چند ممالک کو چھوڑ کر بیشتر ممالک میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔اب بھی انھیں بہت سے ممالک میں پرائمری سطح پر تعلیم کا حق تو دیا گیا ہے لیکن سکینڈری لیول پر حق تعلیم کا ذکر نہیں ہے۔اس کے علاوہ کچھ ممالک کے دساتیر میں سب کو حق تعلیم کی بات تو کہی گئی ہے مگر کہیں پر بھی جنس کا حوالہ نہیں ہے۔علاوہ ازیں بہت سے ممالک کو اقوام متحدہ نے جو تعلیم کا ہدف مقرر کیا ہے اس سے ابھی بہت دور ہیں۔

یونیسکو کی ایک رپورٹ جو، ٹائمز آف انڈیا مورخہ 6 ستمبر 2016 میں شائع ہوئی ہے،اس کے مطابق بھی ابھی خود ہندوستان اس ہدف کو پورا کرنے کے معاملے میں 50 سال پیچھے ہے۔ یہاں تک کہ پرائمری اسکول کی عمر والے 2.9 ملین بچے اسکول نہیں جارہے ہیں۔سکینڈری اور اس سے اوپر سطح پر بھی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔اقلیتی خواتین کی حالت تو اور بھی زیادہ تشویشناک ہے۔درج ذیل ٹیبل میں ہمارے ملک میں مردوں وعورتوں کی شرح خواندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ٹیبل

2011 کی مردم شماری کے اعدادوشمار کی بنیاد پر ریاستوں میں مردوں اورعورتوں کی شرح خواندگی:

ریاست	شرح خواندگی	مرد	خواتین
انڈمان اورنکوبار از لینڈ	86.3%	90.1%	81.8%
آندھراپردیش	67.7%	75.6%	59.7%
اروناچل پردیش	67.0%	73.7%	59.6%
آسام	73.2%	78.8%	67.3%
بہار	63.8%	73.5%	53.3%
چنڈی گڑھ	86.4%	90.5%	81.4%
چھتیس گڑھ	71.0%	81.5%	60.6%
دادرااورناگرحویلی	77.7%	86.5%	65.9%
دمن اوردیو	87.1%	91.5%	79.6%
دہلی	86.3%	91.0%	80.9%
گوا	87.4%	92.8%	81.8%
گجرات	79.3%	87.2%	70.7%
ہریانہ	76.6%	85.4%	66.8%
ہماچل پردیش	83.8%	90.8%	76.6%
جموں وکشمیر	68.7%	78.3%	58.0%
جھارکھنڈ	67.6%	78.5%	56.2%
کرناٹک	75.6%	82.8%	68.1%
کیرالہ	93.9%	96.0%	92.0%
لکشدیپ	92.3%	96.1%	88.2%
مدھیہ پردیش	70.6%	80.5%	60.0%
مہاراشٹر	82.9%	89.8%	75.5%
منی پور	79.9%	86.5%	73.2%

میگھالیہ	75.5%	77.2%	73.8%
میزورم	91.6%	93.7%	89.4%
ناگالینڈ	80.1%	83.3%	76.7%
اڈیسہ	73.5%	82.4%	64.4%
پانڈیچری	86.5%	92.1%	81.2%
پنجاب	76.7%	81.5%	71.3%
راجستھان	67.1%	80.5%	52.7%
سکم	82.2%	87.3%	76.4%
تملناڈو	80.3%	86.8%	73.9%
تری پورہ	87.8%	92.2%	83.1%
اترپردیش	69.7%	79.2%	59.3%
اتراکھنڈ	79.6%	88.3%	70.7%
ویسٹ بنگال	77.1%	82.7%	71.2%
انڈیا	74.04%	82.14%	65.46%

متذکرہ بالا ٹیبل سے اس بات کا بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کی شرح خواندگی مردوں کے مقابلے میں کافی کم ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق مسلم خواتین کی شرح خواندگی 59.1 فیصدی ہے جب کہ ہندو خواتین کی شرح خواندگی 65.1 فیصدی ہے اور جین خواتین کی شرح خواندگی 94.1 فیصدی ہے عیسائی، سکھ و بودھ خواتین کی شرح خواندگی بالترتیب 80.3 فیصدی، 69.4 فیصدی و 72.7 فیصدی ہے۔ مسلم خواتین کی یہ شرح خواندگی صرف قرآن کریم پڑھنے اور بنیادی دینی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ہے ورنہ اگر روزگار کے نقطۂ نظر سے شرح خواندگی کا تعین کیا جائے تو شاید یہ شرح ایک فیصدی یا اس کے آس پاس ہی آئے گی۔

آیئے اب ہم شرح خواندگی کے معاملے میں ہندوستان کی شماریاتی حیثیت کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ ہم اس میدان میں کتنے پچھڑے ہوئے ہیں اور یہ کہ آئندہ ہماری حکومت کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے اور یہ کہ عوام کو کس طرح اس بات کا احساس دلایا جائے کہ تعلیم کے بغیر باوقار زندگی جینا تقریباً ناممکن ہے۔ آج کے اس مہذب معاشرے میں جاہلیت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مبارکباد کے مستحق ہیں وہ ممالک اور علاقے جہاں شرح خواندگی سو فیصدی تک پہنچ چکی ہے۔ ہمیں اپنا مقابلہ ایسے ممالک سے کرنا چاہیے نہ کہ ان ممالک سے جن کی شرح خواندگی ہم سے کم ہے۔ درج ذیل ٹیبل میں شرح خواندگی کے حوالے سے ان ممالک وعلاقوں کا احاطہ کیا گیا ہے جہاں شرح خواندگی ہمارے ملک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے:

دنیا میں سب سے زیادہ شرح خواندگی والے ممالک اریاستیں

ممالک	شرح خواندگی
انڈورا	100.0%
فن لینڈ	100.0%
گرین لینڈ	100.0%
لکسٹینٹین	100.0%
لکشمبرگ	100.0%
ناروے	100.0%
آذربائیجان	99.8%
لٹویا	99.8%
کیوبا	99.8%
اسٹونیہ	99.8%
جیورجیا	99.7%
تاجکستان	99.7%
یوکرین	99.7%
روس	99.7%
پولینڈ	99.7%
سلوینیا	99.7%
قزاقستان	99.7%
لتھوانیہ	99.7%
باربیڈوز	99.7%
آرمینیا	99.6%
سلواکیہ	99.6%
ترکمانستان	99.6%
بیلاروس	99.6%
ازبکستان	99.4%
کرغزستان	99.2%

(خواتین کی اختیارکاری وصنفی مساوات، خواجہ عبدالمنتقم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2018)

□□□

اٹوٹ رشتہ

ترنم جمال

جاڑے کی سرد اور اندھیری رات تھی۔ میں پیکنگ میں مصروف تھا کیونکہ صبح مجھے شہر کے لیے نکلنا تھا۔ صبح سویرے ہی بس تھی، ورنہ پھر گیارہ بجے دن میں ملتی۔ وہاں سے مجھے بذریعہ ٹرین اپنی سروس پر نکلنا تھا۔ جوائننگ لیٹر آ گیا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ دالان میں میری کچھ کتابیں پڑی ہیں انھیں رکھ لوں۔

کتابیں لینے گیا تو پھوا اماں کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر بیٹھی روئے جا رہی تھیں۔ میں نے ان کے قریب جا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا پھوا اماں، آپ ابھی تک سوئی کیوں نہیں، اور آپ رو کیوں رہی ہیں۔'' انھوں نے میری طرف دیکھا اور کسی معصوم بچے کی طرح بلکتے ہوئے کہا۔ ''کیا بتاؤں میں، تم اپنے دوستوں کے ساتھ رات گئے تک باہر رہتے ہو، گھر آتے ہو، کھانا کھاتے ہو اور سو جاتے ہو۔ بھیا نے آج کھانا نہیں کھایا۔ بھوکے پیٹ ہی سو گئے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ اس لیے آپ خود کو ہلکان کر رہی ہیں اور یقیناً آپ نے بھی کھانا نہیں کھایا ہوگا۔''

''لو بھئی یہ نئی بات کہی تم نے۔ بھیا کو کھانا کھلائے بغیر کبھی میں نے کھایا ہے۔''

''اچھا تو یہ بتائے ابا نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔ ضرور آپ نے آج سالن میں نمک مرچ کم ڈالی ہوگی۔ کیوں ہے نہ یہی بات''، میں نے زیر لب شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

انھوں نے مجھے پیار سے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''اب باتیں مت بناؤ۔ جا کر سو جاؤ کافی رات ہو گئی ہے۔ صبح آنکھ نہیں کھلے گی۔''

میں اپنے بستر پر دراز پھوا اماں اور ابا کی بے پناہ محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کے لیے جیتے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے، گھن گرج کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ ابا کسی کام سے کھیت پر گئے تھے۔ جب تک وہ نہیں لوٹے پھوا اماں دروازے پر کھڑی روتی رہیں اور ساتھ ہی ابا کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہیں۔ ابا پھوا اماں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا پسند کرتے تھے۔ ان کے لیے کھانا وہی بناتی تھیں اور جب کبھی ابا کا موڈ خراب ہوا تو ان کے غصے کی زد میں بھی وہی بے چاری آتی تھیں۔ جیسے ہی پھوا اماں کھانا لے کر جاتیں، ایک دو نوالے کھانے کے بعد ابا غصے میں برتن اٹھا کر پھینک دیتے۔

''سجو کیسا کھانا بنایا ہے، نہ نمک ہے نہ مرچ ہے سالن میں۔'' اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کھانے میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ بھائی کو منانے کے ہزار جتن کرتیں۔ کیونکہ ان کے سوا ابا کو کوئی رضامند نہیں کر سکتا تھا۔

یوں تو ابا بہت نیک دل صالح پسند انسان تھے۔ ضرورت مندوں کی مدد اس طرح کرتے کہ داہنے ہاتھ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہوتی تھی۔ اکثر کھلیان سے ہی غلہ اٹھا کر دے دیتے۔ گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا ان کی عزت کرتا۔ سبھی کا یہ خیال تھا کہ گاؤں میں سب سے بزرگ انسان احمد صاحب ہی ہیں۔

صبح پھوا اماں کے اٹھانے سے آنکھ کھلی۔ نکلنے سے پہلے ابا سے ملنے گیا تو وہ نوکر کو ہدایت دے رہے تھے۔ بابو کو بس میں بیٹھا دو گے اور جب تک بس روانہ نہیں ہوگی تم وہیں رہنا۔ میں نے اپنا بیگ نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ ''ابا میں چلا جاؤں گا، اسے بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ یہ ساتھ جائے گا تمھارے اور ایک بات سن لو، اس دفعہ کوئی بہانہ نہیں سنیں گے ہم۔ تمھاری شادی ہم نے طے کر دی ہے۔ چھٹی میں آؤ گے تو اس فرض کو انجام دیں گے۔''

''ابا اتنی جلدی؟ کچھ دن تو سروس کا مزہ لینے دیجیے، اتنی جلدی تو مت کیجیے۔''

''نہیں اب تمھاری بالکل نہیں سنیں گے۔ ہمیں پوتے پوتی دیکھنے کا ارمان ہے۔ اتنا بڑا گھر تمھارے چلے جانے کے بعد سونا لگے گا۔'' اور میں نے سرتسلیم خم کردیا۔

سروس جوائن کیے ہوئے ابھی ایک مہینہ ہوا تھا کہ ابا کا خط آیا لکھا تھا۔ احسان چھٹی کے لیے درخواست دے دو۔ اگلے مہینے کی سات تاریخ کو تمھاری شادی ہے۔ دلہن کے والد بھی کلکتہ میں سروس کرتے ہیں ان کی دسہرہ کے تہوار میں چھٹی ہے۔ اس لیے یہی طے پایا ہے۔ خط پڑھنے کے بعد میں بستر پر دراز ہوکر سوچ میں گم ہوگیا۔ اپنی ہونے والی شریک زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ابا کلکتہ کی لڑکی کو گاؤں میں لائیں گے۔ وہ بھلا کیسے نباہ کرے گی گاؤں کے ماحول میں۔ یوں تو ان لوگوں کا آبائی گاؤں ہمارے گاؤں کے قریب ہی ہے شاید اسی لیے شادی وہاں ہونا طے پائی ہے۔

میں سوچ میں غرق تھا کہ ہمایوں پہنچ گیا۔ وہ ہمارے گاؤں کا ہی تھا اور یہاں مال گاڑی میں ڈرائیور تھا۔ اسے کوارٹر نہیں ملا تھا اس لیے ہمارے ساتھ ہی رہ رہا تھا آتے ہی کہنے لگا۔ ''بھیا سنا ہے آپ کی بارات ہاتھی پر جائے گی۔ کیا یہ سچ ہے۔'' ۔ سو فیصد سچ ہے۔ ابا کو میری شادی کا بہت ارمان ہے۔ ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی اتنی دھوم دھام سے ہو کہ لوگ ہمیشہ یاد رکھیں۔''

'' میں ابھی سے چھٹی کی عرضی دے دیتا ہوں۔ وہ خوشی سے جھومنے لگا۔'' واہ کیا مزہ آئے گا ہاتھی پر بارات جائے گی۔''

میں گھر کے آنگن میں دولہا بنا بیٹھا ہوا تھا۔ پھوا اماں دعائیں پڑھ کر پھونکتی جارہی تھیں۔ ساتھ ہی نصیحتیں بھی کرتی جارہی تھیں بارات نکلنے سے پہلے ابا کو اچھی طرح سمجھایا کہ بھیا دلہن خوشی خوشی گھر لے کر آنا۔

بارات جب ہماری سسرال پہنچی تو دیکھنے والوں نے دانتوں تلے انگلی دبالی۔ بوڑھے پرانے لوگ حیرت زدہ تھے کہ زمیندار کا دور تو گزر گیا، پھر بھی اس شان سے ہاتھی پر بارات وہ بھی سات سات ہاتھی پر باراتی سوار۔ بچے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ دلہن والوں نے ان کے شایان شان بارات کا استقبال کیا۔

میں اپنے دوستوں کے درمیان خوش گپیوں میں مگن تھا کہ تبھی میرا دوست اشرف بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ ''احسان جلدی چلو چچا سے کسی کا جھگڑا ہوگیا ہے۔'' اتنا سننا تھا کہ میں سہرا پھینک کر اٹھ کھڑا ہوا، ابا نے مجھے آتا دیکھا تو واپس چلے جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن میں کہاں سننے والا تھا کہ ابا سے کوئی بدتمیزی کرے اور میں خاموش رہوں۔ ہمارے گاؤں میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ابا سے نظریں ملا کر بات کرے اور یہ شاید دلہن کے چھوٹے ماموں تھے، جو اپنی جوانی کے خمار میں ڈوبے ہوئے تھے اور ہاتھی والے کو سامان دینے کی بات پر ابا سے الجھ رہے تھے۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوا، میں اپنے پورے جاہ وجلال میں آگیا۔ گھر کے اندر عورتوں میں بات چلی گئی کہ دولہا لڑائی کررہا ہے تو وہاں رونا پیٹنا شروع ہوگیا، گویا اچھا خاصا تماشہ کھڑا ہوگیا۔

کچھ ہی دیر میں صلح صفائی ہوگئی لیکن ابا کے دل کو یہ بات لگ گئی۔ شادی میں بدمزگی نہ ہو اس لیے وہ گاؤں سے کسی ایسے شخص کو بارات میں نہیں لے کر گئے تھے، جو شادیوں میں ہنگامہ کرنے کے لیے مشہور تھے۔ مگر ابا نے سب کے کافی سمجھانے کے بعد بھی کھانا نہیں کھایا۔ ناراض ابا کو صرف پھوا اماں ہی منا سکتی تھیں پھر بھی اماں نے مجھے ساری رسموں کو خوشی خوشی ادا کرنے کے لیے کہا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

میں دلہن کو لے کر گھر آیا تو جو باراتی پہلے پہنچ گئے تھے ان کے ذریعہ ساری خبر پھوا اماں کو ہمارے آنے سے پہلے ہی مل گئی تھی۔ عورتوں نے دلہن کو ڈولی سے اتار کر آنگن میں چوکی پر بٹھایا اور مجھے بھی ساتھ میں بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ پھوا اماں آئیں، میں نے انھیں جھک کر سلام کیا اور میرا سر جھکا کا جھکا رہ گیا۔ پھوا اماں اپنی کھڑاؤں اتار کر مجھے مارنے لگیں۔ میں بھی دولہا بنا مار کھاتا رہا۔ محفل میں سناٹا چھا گیا۔ عورتیں جو دلہن دیکھنے کے لیے آئی تھیں آپس میں کہنے لگیں ''بتاؤ بھلا، ایسا بھی کیا غصہ کہ شہانی دلہن کے سامنے ہی پیٹ ڈالا بیچارے کو۔''

ایک عرصہ ہوا ابا اور پھوا اماں دونوں ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ دونوں بھائی بہن کی اس قدر اٹوٹ محبت کہ ایک دوسرے کے بغیر دو ماہ سے زیادہ عرصہ نہیں رہ سکے۔

پھوا اماں کا جب رجب کے مہینے میں انتقال ہوا تو ابا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ سجو ہم کو اکیلے چھوڑ کر چلی گئی۔ اب کیسے رہیں گے اور وہ یہ غم زیادہ دن برداشت نہیں کرسکے اور اسی سال رمضان کے مبارک مہینہ میں اپنے پوتے پوتیوں اور ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔

دونوں اپنے مزاج کے مالک تھے۔ شاید کچھ اثر مجھ پر بھی پڑا ہے۔

●●●

Tarannum Jamal
C/O. S.M. Pervez Karim
26, Zakaria Street
Top Floor
Kolkata-700073 (W.B)

افسانہ

سیدہ تبسم منظور ناڈکر

ملن

دن ڈھل چکا تھا۔آسمان پر کالے بادل گشت کر رہے تھے۔ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھی۔وہ سمندر کے کنارے بیٹھا اپنے ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔پانی کی سطح پر جیسے کوئی فلم چل رہی ہو اور ایک ایک کر کے سارے مناظر نگاہوں کے سامنے آرہے تھے۔

ایک ایسی ہی خوبصورت سہانی شام تھی۔جب وہ ملنے آئی تھی۔ اس نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔بادل نے سورج کو اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔جیسے ہر چیز پر مستی سی چھائی ہو اس کے دل میں بھی ارمان مچلنے لگے۔اس نے ایک آہ بھری اور دل ہی دل میں بڑبڑایا کتنے دن ہو گئے عرشی کو دیکھے ہوئے جو پھول کی طرح نازک اور چاند کی طرح اُجلی تھی۔ دونوں میں کتنا پیار تھا۔ایک دن بنا ملے قرار نہ آتا کبھی کھیتوں میں کبھی کسی آم کے پیڑ کے نیچے کبھی امرود کے پیڑ سے کچے پکے امرود توڑتے کبھی کسی آبشار کے پاس۔۔۔کتنی محبت تھی دونوں میں۔۔۔کبھی سوچا نہیں تھا کہ محبت کا اتنا برا انجام ہوگا۔یوں ہی ماضی کے دریچے کھلتے گئے۔

کیا خوبصورت دن تھے۔مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ خوشی کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔پتہ ہی نہیں چلتا کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی۔۔۔

گزرتے وقت کے ساتھ وہ قریب ہوتے گئے اور ان کا پیار گہرا ہوتا گیا۔ ان کے پیار کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ فضا میں بکھر گئی۔۔۔۔اور یہ خوشبو عرشی کے گھر تک پہنچ گئی۔اسے یاد آیا ایک سہانی شام کو دونوں سمندر کے کنارے بیٹھے تھے۔اچانک عرشی نے کہا۔

ارمان تم مجھے بھول گئے تو نہیں نا؟؟

کیا بات ہے عرشی آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو!!

وہ بہت ہی بے بسی سے بولی" آج مجھے پاپا نے بہت ڈانٹا اور گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی لگا دی۔۔۔اب شاید ہم مل بھی نہیں سکیں گے۔

اب تو عرشی پر پابندیاں لگ چکی تھی۔ارمان اکیلا ہی سمندر کے کنارے بیٹھ کر بانسری بجاتا اس کی دھن میں غضب کا درد ہوتا۔۔۔ان کے پیار کے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے۔

عرشی زمیندار کی بیٹی تھی اور ارمان ایک ملاح کا بیٹا تھا۔ارمان نے جوانی کی دہلیز پر قدم بھی نہ رکھا تھا کہ اس کے ماں باپ کی موت ہو گئی۔تھوڑی سی زمین تھی اس پر چچا نے پہلے ہی قبضہ کر لیا۔جو گھر تھا اس کو بھی ارمان سے چھین لیا اور گھر سے باہر کر دیا۔وہ بے یار و مددگار ہو گیا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کرے ایسے میں اس کے ایک دوست نے ساتھ دیا اور سمندر کے اس پار اسے اپنے ساتھ لے گیا۔اسی گاؤں میں عرشی کا گھر تھا۔ اچانک اس کی عرش سے ملاقات ہوئی۔عرشی سے ملنے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرنے لگے تھے۔ایک دن اچانک ارمان عرشی کے گھر پہنچا تو اس کی ماں کے الفاظ کانوں میں پڑے۔کسی سے کہہ رہی تھی میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کروں گی جو بہت پیسے والا ہو، نوکر چاکر ہو جو میری بیٹی کو سونے سے لاد دے۔وہ مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ آیا۔

جب امید کے چراغ بجھ جائے تو زندگی ویران ہو جاتی ہے۔

اب اس گاؤں میں رہ کر وہ کیا کرے گا۔یہ سب چیزیں وہ کہاں سے لائے گا جو عرشی کی ماں چاہتی تھی۔ایسی ہی ایک سہانی شام کو وہ اور عرشی آخری بار ملے تھے۔

عرشی خاموش کھڑی آنسو بہا رہی تھی اور بہت اداس اور مرجھائی لگ رہی تھی جیسے کسی ڈالی سے ٹوٹ کر پھول مرجھا جاتا ہے۔مفلسی سب سے بڑی سزا ہے اور غریب کو خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہوتا ہے۔تھوڑی

دیر تک وہ دونوں معصوم آنسو بہاتے رہے۔

ارمان نے کہا" عرشی تمھارے آنسو میرا دل چھلنی کر رہے ہیں.. آج کے دور میں دولت کی پوجا ہوتی ہے۔۔۔دلوں کا کوئی مول نہیں۔۔۔۔مانا ہمارے بیچ یہ سمندر ہے پر دو دلوں کے بیچ تو کوئی چیز حائل نہیں ہے۔محبت ہمیشہ امر ہوتی ہے۔۔۔۔۔ وہ کبھی نہیں مٹ سکتی۔۔۔۔۔میرے دل میں دماغ میں خوابوں میں خیالوں میں ہمیشہ تم ہی رہوگی۔میرے لیے یہی کافی ہے کہ کسی کو میرا خیال ہے۔۔۔۔۔کوئی مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔اِس سے آگے اُس کی زبان لرزنے لگی اور آگے کچھ نا کہہ سکا۔

عرشی نے اپنی بھیگی پلکیں اٹھائیں اور بولی۔۔۔۔ "میں تم کو کبھی بھلا نہیں سکتی ہم دونوں نے مل کر اس محبت کے پودے کو سینچا ہے۔۔۔۔ ایک ساتھ سپنے سجائے ہیں ہمارا پیار امر ہے۔۔۔ چاہے ہماری محبت کے بیچ کتنے ہی سمندر کیوں نہ آئیں۔"

اتنے میں اس سے کسی نے کہا" ارے بھائی اٹھو جلدی مجھے جھیل کے اس پار پہنچا دو۔مجھے جلدی پہنچنا ہے"۔

اس آواز سے ارمان کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

وہ بولا ارے صاحب کیا بات ہے؟؟؟

" ارے بھائی جلدی سے اپنی کشتی نکالو اور مجھے اس پار پہنچا دو۔۔۔۔۔جو مانگو گے دوں گا۔۔۔۔بارات وہاں پہنچ گئی ہوگی۔"

بارات۔۔۔کس کی بارات؟؟ ارمان نے غور سے اس شخص کو دیکھا کوئی پینتالیس یا پچاس سال کا ہوگا۔۔۔

کیا آپ کے بیٹے کی شادی ہے؟؟

نہیں نہیں میری شادی ہے!!!!

آپ کی شادی؟؟؟ ارمان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

" ہاں میری شادی تم اتنے حیران کیوں ہوگئے؟ یہ دیکھو لڑکی کے سارے زیور میرے پاس ہے۔ میں ایک زمیندار ہوں۔ دھن دولت کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

ارمان حیران کن نظروں سے اس شخص کو دیکھنے لگا۔

" ارے بھائی تم کیا سوچنے لگے اٹھو جلدی مجھے اس پار لے چلو۔"

ارمان اٹھا اور اس مسافر کو بیٹھا کر کشتی چلانا شروع کی۔۔۔اپنے چھوٹے موٹے کام کے ساتھ وہ ملاح کا بھی کام کرتا۔

صاحب! کیا آپ کی پہلی شادی ہے؟؟

نہیں!! یہ میرا تیسرا بیاہ ہے۔۔۔۔پہلی دو بیویاں مر چکی ہیں۔ تین بیٹیاں ہیں ان کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔

اچھا گاؤں میں کس کی لڑکی سے شادی کر رہے ہو؟؟

" زمیندار کی بیٹی ہے۔۔۔۔۔سنا بہت خوب صورت ہے۔۔۔اور ان کو دولت مند گھرانے میں رشتہ چاہیے تھا"۔

آہستہ آہستہ کشتی کنارے پر لگی۔مسافر نے اس کی اجرت دی اور اپنا سامان لے کر اتر گیا۔

ارمان کا دل ڈوبنے لگا۔۔۔۔ایک نظر نیلے آسمان کی طرف ڈالی جو کالے بادلوں سے گھر چکا تھا۔۔۔شام کے سائے سارے عالم پر پھیل رہے تھے۔

اس نے کشتی کو کنارے سے باندھا اور مسافر کے پیچھے چل دیا۔

گاؤں میں داخل ہوا تو اس کے منہ سے ایک سرد آہ نکلی۔۔۔۔۔وہ اداس اداس بوجھل قدموں سے چلتا رہا۔۔۔قدم قدم پر اس کی محبت کے ورق بکھرے پڑے تھے۔خاموشی سے ایک جگہ بیٹھ گیا۔

رات کی سیاہی پوری کائنات پر اپنی زلفیں پھیلا چکی تھی۔۔۔۔ اچانک ایک آہٹ ہوئی۔۔۔۔۔دوسرے ہی پل کچھ خوشبو سی محسوس ہوئی۔۔۔۔۔اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سامنے لال سہاگ کا جوڑا زیب تن کیے ہوئے۔۔۔۔۔زیورات سے آراستہ دلہن بنی عرشی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

ارمان تم۔۔۔۔!!! اچھا ہوا تم آگئے۔۔۔۔میری کسی کو فکر نہیں۔۔۔۔سب کھانے پینے۔۔۔موج مستی میں لگے ہیں۔۔۔۔میں گھر چھوڑ آئی ہوں۔آج کی ملاقات کس قدر اچانک ہوگئی۔

کشتی کنارے ہے عرشی۔۔۔چلو۔۔۔۔

اس کی کوئی ضرورت نہیں ارمان!!!! اور تیزی سے سمندر کی طرف بھاگنے لگی۔۔۔ ارمان بھی اس کو پکڑنے اس کے پیچھے بھاگا۔۔۔۔عرشی نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔۔۔ارمان نے اس کو پکڑنا چاہا مگر اس کا پیر پھسل گیا۔

اسی وقت ایک بڑی لہر آئی اور دو پیار کرنے والوں کو بہا کر لے گئی۔۔۔......

□□□

Syeda Tabassum Manzoor Nadkar
226/ 1807 Road No. 6
Motilal Nagar No. 1
Goregaon-400104 (W) Mumbai

ڈاکٹر فریدہ تبسم

آئینہ

میں حیرت کی اتاہ گہرائیوں میں مبہوت اپنے آپ میں سوال بن گئی تھی۔ وہ چھٹیوں کے دن تھے۔ موسم گرم تھا۔ میں اپنے شہر کی گرمی سے گھبرا کر کہیں جانا چاہتی تھی یا پھر ایسے ناول کا مطالعہ جس میں تجسس ہی تجسس ہو۔ نئی فکر و نیا خیال پیش کیا گیا ہو۔ میری یہ دلی تمنا اس وقت پوری ہوئی جب میں نے بازار جانے کا قصد کیا۔ ہر طرف شور وغل تھا۔ بازار تو آخر بازار ہوتا ہے گہما گہمی کا عالم۔ اس بھیڑ میں کوئی جلد سے جلد اپنے حسین خوابوں کو پورا کرنا چاہتا تھا تو کوئی تمناؤں کے پَر لگا کر اڑنا چاہتا تھا۔ بازار کی چکاچوند سے گھبرا کر میں ایک طرف چلنے لگی۔ چلتے چلتے اچانک میں رک گئی میں نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب لباس پہنے جابجا رنگ برنگی پیوند میں ملبوس عمر رسیدہ شخص الگ تھلگ اپنی دنیا میں مگن ہاتھ میں کتاب پکڑے ایک پتھر پر بیٹھا تھا۔ بازو میں ایک بڑا سا بستہ رکھا ہوا تھا جس میں ضرورت کی اشیاء موجود تھیں۔ وہ شخص کتاب میں اس قدر منہمک تھا کہ دنیا و مافیہا کی اسے خبر نہیں۔ اچانک جب میری نظر اُس پر پڑی تو مجھے خیال آیا کہ بچپن میں نانی دادی اپنی کہانیوں میں اسی قسم کے اشخاص کا ذکر کیا کرتیں تھیں۔ میرا اشتیاق بڑھا اور میں اس شخص سے بات کرنے کی غرض سے آگے بڑھی اور اس عمر رسیدہ بزرگ کے قریب پہنچ کر آواز دینی شروع کی۔ بابا! او بابا۔۔۔۔ ذرا سنئے! میں آپ ہی سے مخاطب ہوں، لیکن کوئی جواب نہیں۔ وہ بزرگ اسی طرح اپنی دنیا میں مگن تھے۔ میں نے آواز بلند کی تو وہ اپنی نگاہیں اوپر کیے بنا کہنے لگے۔ محترمہ۔۔۔۔۔۔ آپ کو اس بازار میں میرے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا جو آپ مجھے ستانے یہاں چلی آئیں۔ میں نے کہا۔ ”بابا میرا مقصد آپ کو ستانا نہیں، میں تو آپ سے کچھ جاننا چاہتی ہوں، آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں؟“ انھوں نے ایک ہی جملہ میں جواب دیا۔ ”میں دنیا میں لایا گیا ہوں خدا جو کام کرواتا ہے کرتا ہوں۔“ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا میں نے وضاحت چاہی تو کہنے لگے آپ نہیں سمجھو گی۔ آپ تو نئی دنیا کی نیا ذہن رکھنے والی ہو۔ ایسی دنیا میں پلی ہو جہاں چمک ہی چمک ہے اور کچھ نہیں۔ تھوڑا وقفے کے بعد کہنے لگے۔ ”بھلا یہ بھی کوئی چمک ہوئی جہاں انسان اصل روشنی سے محروم رہے۔“ میں تمھیں بتاتا ہوں ایک ایسی دنیا کی کہانی جہاں انسان اندھیرے میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی زندگی کی اصل روشنی کہیں کھوگئی تھی۔ بلکہ میں تو اسی دنیا کے بارے میں اس کتاب میں پڑھ رہا تھا میرا تجسس بڑھتا گیا۔ اس کتاب کو حاصل کرنے کے لیے میں بابا سے بار بار ملاقاتیں کرتی رہی اور ایک دن میں بابا سے اصرار کر کے وہ کتاب گھر لے آئی۔ آج میں گھر جلد سے جلد پہنچنا چاہتی تھی۔ جب میں نے کتاب کھولی تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ دیکھ کر کہ کتاب کھولتے ہی پہلا ورق جس پر اس کا عنوان لکھا تھا۔ لفظ ”عنوان لکھ کر“ ”آئینہ“ چسپاں کیا گیا تھا۔ کتاب کھولتے ہی پڑھنے والے کو اپنی صورت نظر آتی تھی۔ کتاب بے حد بوسیدہ تھی۔ میں اوراق پلٹتی گئی۔ اس کتاب کے مطالعہ نے مجھے حیرت میں ڈالا۔ دراصل وہ ایک ایسے عجیب و غریب گاؤں کی کہانی تھی جہاں کے سارے لوگ ”اندھے“ تھے۔ سوائے اس برگزیدہ بزرگ ہستی کے جو دیکھ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے چہرے کو سفید نقاب سے ڈھک لیا تھا اور لباس کالا ڈھیلا ڈھالا جس میں جابجا آئینہ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ صرف آنکھیں ہی واضح طور پر نظر آتی تھیں۔

یہ گاؤں انھیں کی وجہ سے آباد تھا۔ گاؤں کے لوگ کافی بدل گئے تھے۔ جب انھوں نے گاؤں کے لوگوں کی حالت دیکھی تو وہ بار بار اندھے لوگوں کا ہاتھ پکڑتے اور انھیں راستہ دکھانے کی کوشش کرتے تا کہ یہ اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ مگر اندھے لوگ اس قدر بپھرے ہوئے تھے کہ قابو میں ہی نہیں آتے تھے۔ اندھے ہونے سے پہلے گاؤں کے لوگ نیک و پارسا ہوا کرتے تھے۔ دولت کی چمک عیش و عشرت کے نشے نے انھیں اندھا بنا دیا تھا۔ یہ لوگ برائیوں اور بداعمالی کا شکار ہو گئے تھے اب انھیں اپنے اندھے ہونے پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ لوگ اندھے رہنا پسند کرتے تھے۔ انھیں آنکھوں کی روشنی واپس لانے کے مختلف نسخے بتائے جاتے تو وہ جھنجھلا اٹھتے۔ اور پکار اٹھتے ہمیں روشنی سے ڈر لگتا ہے۔

نقاب پوش بزرگ کو ایک طرف یہ اطمینان تھا کہ اس چکا چوند دنیا کی چمک سے دور یہ لوگ اندھیری دنیا میں پُرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ پھر یہ بھی ملال تھا کہ خیر و شر تو اس دنیا کے دو حصے ہیں۔ انھیں شر کو نظر انداز کر کے خیر کی طرف قدم بڑھانے تھے۔ اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے آنکھوں کا روشن ہونا ضروری تھا۔ انھیں ہر بار کسی نہ کسی طریقہ سے آگاہ کیا جاتا کہ تمھیں تمھاری آنکھوں کی روشنی واپس لانی ہوگی۔ وہ کہتے کہ ''ہم اندھیرے میں سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ روشنی میں جو سارے کام ہوتے ہیں وہ ہمارا چین و سکون چھین لیتے ہیں۔

وہ بزرگ بارہا فکر مند رہتے۔ یہ لوگ نہ صرف آنکھوں سے اندھے تھے بلکہ ان کے قلب بھی ظلمات میں ڈوبے ہوئے تھے انھیں یقین تھا کہ جب ان کی نظر واپس آ جائے گی تو ان کے دل بھی آئینہ کی طرح چمک اٹھیں گے۔ اس بار انھوں نے نیا پلان بنایا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ بالکل اسی طرح کیا جائے اور بزرگ اپنے کام میں جٹ گئے۔ انھوں نے گاؤں میں بہت بڑا میلہ لگایا۔ یہ میلہ ایسا میلہ تھا جہاں گاؤں کے سب سے اونچے پہاڑ پر ''آئینہ گھر'' بنایا گیا۔ جہاں آئینوں کو قرینہ سے اس خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کہ ایک کا عکس دوسرے پر پڑتا تو روشنی بڑھ جاتی اور اس قدر چمک پیدا ہوگئی کہ سارا گاؤں ان آئینوں کی چمک کی وجہ سے جگمگا اٹھا۔ یہ آئینے گاؤں کے لوگوں کی تعداد کے حساب سے لگائے گئے تھے جو ایک دوسرے کے برعکس رکھے گئے تھے۔ اب اصل کام یہ کرنا تھا کہ گاؤں کے تمام لوگوں کو اکٹھا کیا جائے اور انھیں اپنے طریقہ سے متاثر کیا جائے اور اس میلہ تک پہنچایا جائے تا کہ ان کی کھوئی ہوئی روشنی واپس آ سکے۔ بزرگ نے بڑی مشکل سے اپنی متاثر کن تقریر سے گاؤں والوں کو راضی کیا اور آئینہ کے اس میلہ میں لے گئے۔ جب گاؤں کے اندھے لوگوں نے ''آئینہ گھر'' میں قدم رکھا تو تیز روشنی جو آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی تھی۔ ان کی آنکھوں پر پڑتے ہی ایسا درد پیدا ہو گیا کہ سب کے سب گھبرانے لگے اور ان کے ماتھے پسینہ سے تر بتر ہو گئے اور وہ گھبراہٹ کے مارے دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے لگے۔ آنکھوں کی چمک نے ان پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب سب لوگوں کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلتی گئیں تو وہ آئینوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے کیونکہ وہ آئینے ایسے تھے جس میں انھیں ان کا جسم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے اعمال کی کتاب ان کے سامنے تھی۔ ان کے سامنے جو آئینہ تھا آدھا کالا اور آدھا سفید روشنی میں چمک رہا تھا جس کی دودھیا روشنی ان کے اندر چھپے ہوئے آئینہ سے ٹکرا رہی تھی۔ جس کی چمک سے ہر آدمی ایک جھٹکے کے ساتھ سنبھلتا جا رہا تھا اور اپنے آپ کو ٹٹولتا اور محسوس کرتا کہ کیا واقعی میں ایسی دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہوں جہاں روشنی ہوتے ہوئے بھی اندھیرا ہے۔ کیا میرے اندر بھی روشنی ہے؟ ہر ایک اپنے اندر کے آئینہ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی اندھیری دنیا روشن ہو گئی تھی۔ جب سب کی آنکھوں میں روشنی آ گئی تو وہ سارے آئینے غائب ہو گئے۔ تب اچانک ان کو اس بزرگ کا خیال آیا جنھوں نے یہ میلہ سجایا تھا۔ سب ان کی تلاش میں لگ گئے۔ وہ اس بزرگ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ جن کی بدولت ان کی آنکھیں کھل گئیں تھیں لیکن ہر جگہ تلاش کیا وہ بزرگ تو غائب ہو چکے تھے۔ کوئی بھی انھیں دیکھ نہیں پایا تھا۔ کتاب ختم ہو چکی تھی۔ میں اس کتاب کو پڑھ کر اپنے اندر کے آئینہ کو تلاش کرنے لگی۔ کیا میری آنکھیں بھی اس دنیا کی چکا چوند میں کہیں کھو گئیں ہیں؟ یہی سوچتے ہوئے میں اس عجیب و غریب لباس بزرگ کی کتاب شکریہ کے ساتھ لوٹا رہی تھی کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ بی بی! کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی۔ میں نے سر جھکا کر صرف ''ہاں'' کہا۔ پھر انھوں نے کہا۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مجھے صرف ایک سوال کا جواب دو۔ کیا واقعی اس دنیا کے لوگوں کی آنکھیں روشن ہیں؟ میں لاجواب ہو گئی۔ وہ بڑے افسوس کے ساتھ کہنے لگے۔ بی بی! اسی لیے میں یہ کتاب بار بار پڑھتا ہوں۔ تا کہ مجھے میرے سوال کا جواب مل سکے۔ درد و کرب سے ان کی آنکھیں بھر آئیں اور میں ہاتھ میں ''آئینہ'' پکڑے کھڑی تھی۔

□□□

Dr.Fareeda Tabassum

Tabassum Villa,Khari Bowli

Mominpura,Gulbarga-585104 (K.S)

تحسین کاظمی

غزلیں

اداسیوں کے سفر کی وہ شام باقی ہے
جگر میں رنج و الم کا قیام باقی ہے

زہر حیات کا پی پی کے روز مرتے رہے
بس ایک موت کا جینے کو جام باقی ہے

جو گر کے اٹھ نہ سکے اشکِ چشم کی مانند
نظر میں میری ترا وہ مقام باقی ہے

اجاڑ دل کے نگر کو نہ کاتب تقدیر
کہ بیوفائی کا اک اس میں نام باقی ہے

چھپا سکیں گے بھلا کیسے دل کے زخموں کو
کہ چشمِ غم کی زباں کا کلام باقی ہے

ٹھہر جا موت گھڑی بھر کو تھوڑی مہلت دے
ابھی نگاہوں کا ان کی پیام باقی ہے

خدا سے مانگ لو تحسین آج عمر دراز
تمھارا ان سے ابھی انتقام باقی ہے

بند مٹھی سے سدا ریت پھسلتے دیکھا
ہم نے نزدیک سے رشتوں کو بدلتے دیکھا

دل میں روشن جو تھے اب تک تری چاہت کے چراغ
اُن چراغوں سے سدا خود کو ہی جلتے دیکھا

ناگہاں ہاتھ اٹھائے ہیں دعا کو جب جب
ہاتھ ہیہات دعاؤں کو بھی ملتے دیکھا

سامنے وہ تھا مگر پھر بھی نہ کچھ کہہ پائی
اپنی پلکوں پہ جو اشکوں کو مچلتے دیکھا

تنہا چھوڑا نہیں غم نے مرا ساتھی بن کر
آ گیا جب بھی مجھے گھر سے نکلتے دیکھا

پھر ہوئے زخم ہرے دورِ خزاں میں تحسین
خشک موسم میں یہاں پھولوں کو کھلتے دیکھا

Tahseen Kazmi
C/o Syed Gulzar Kazmi
Mirza International Ltd.
Kisan Transport Co.
Near Purani Chungi
Buland Shahar Road
Hapur-245101 (U.P)

لذیذ پکوان

کوکونٹ فش کری

اجزا: مچھلی (بغیر کانٹے کے قتلے) ایک کلو، ادرک لہسن پسا ہوا ایک کھانے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، پیاز (باریک کٹی ہوئی) ایک عدد درمیانی، ٹماٹر (کٹے ہوئے) دو عدد درمیانی، لال مرچ پسی ہوئی ایک کھانے کا چمچ، دھنیا پسا ہوا ایک کھانے کا چمچ، سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، میتھی دانہ آدھا چائے کا چمچ، ناریل کا دودھ (ٹپ دیکھیں) ڈیڑھ پیالی، ثابت رائی آدھا چائے کا چمچ، کوکنگ آئل چار کھانے کے چمچ

ترکیب: دیگچی میں کوکنگ آئل کو ہلکی آنچ پر تین سے چار منٹ تک ہلکا گرم کرکے رائی اور میتھی دانہ ڈالیں۔

جب کڑکڑانے لگیں تو پیاز ڈال کر اتنی دیر فرائی کریں کہ ہلکی سی نرم ہوجائے۔

ادرک لہسن، لال مرچ، ہلدی، دھنیا، زیرہ اور ٹماٹر شامل کرکے اتنی دیر بھونیں کہ تیل علیحدہ سے نظر آنے لگے۔ دیگچی میں مچھلی ڈالیں اور کپڑے کی مدد سے دیگچی کو ہلکا سا ہلالیں تاکہ مچھلی ٹوٹنے سے محفوظ رہے اور مصالحہ مچھلی پر اچھی طرح سے لگ جائے۔

ناریل کا دودھ ڈال کر دو سے تین منٹ آنچ تیز کرکے اُبال آنے دیں۔ پھر ڈھک کر پانچ سے سات منٹ تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔

ٹپ: ناریل کا دودھ بنانے کے لیے ایک پیالی پسے ہوئے تازہ خشک ناریل میں آدھی پیالی ٹھنڈا پانی ڈال کر ایک سے دومنٹ کے لیے بلینڈر میں بلینڈ کرلیں۔

چکن فرائیڈ رائس

اجزا: چاول ایک کلو، چکن (بغیر ہڈی کی بوٹیاں) آدھا کلو، نمک حسب ذائقہ، لہسن پسا ہوا ایک چائے کا چمچ، ہری پیاز (باریک کٹی ہوئی) تین سے چار عدد، گاجر (باریک کٹی ہوئی) دو عدد، بند گوبھی (باریک کٹی ہوئی)

ایک عدد چھوٹی، سرکہ دو کھانے کے چمچ، سویا ساس چار کھانے کے چمچ، سفید مرچ پسی ہوئی ایک کھانے کا چمچ، چینی ایک کھانے کا چمچ، چائنیز نمک ایک چائے کا چمچ، انڈے تین عدد، کوکنگ آئل چار سے چھ کھانے کے چمچ

ترکیب: چاولوں کو ابال کر پانی نتھار لیں اور چار سے چھ گھنٹوں کے لیے ڈھک کر فریج میں رکھ دیں۔

کڑاہی میں درمیانی آنچ پر کوکنگ آئل کو دو سے تین منٹ تک گرم کریں۔ لہسن ڈال کر ایک سے دو منٹ فرائی کریں۔ پھر چکن ڈال کر اتنی دیر فرائی کریں کہ چکن کا اپنا پانی خشک ہو جائے۔

پھر چاول ڈال کر دو چمچوں کی مدد سے اتنی دیر ملائیں کہ چاول اچھی طرح گرم ہو جائیں۔

چاولوں میں بند گوبھی، گاجر اور ہری پیاز ڈال کر ملائیں۔ ایک منٹ بعد نمک، چینی، سفید مرچ اور چائنیز نمک شامل کر کے اچھی طرح ملائیں۔ انڈوں کو نمک اور چٹکی بھر سفید مرچ کے ساتھ ہلکا سا پھینٹ لیں اور چاولوں پر ڈال دیں۔ آخر میں سرکہ اور سویا ساس ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ مزیدار چکن فرائیڈ رائس تیار ہیں۔

میکرونی ود پران

اجزا: جھینگے آدھا کلو، ابلی میکرونی آدھا پیکٹ، دودھ آدھا کلو، لہسن کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچہ، پارسلے ایک چوتھائی گٹھی، بھنا ہوا میدہ 3 سے 4 کھانے کے چمچے، اوریگانو آدھا چائے کا چمچہ، روزمیری آدھا چائے کا چمچہ، کٹی لال مرچ ایک چائے کا چمچہ، نمک حسبِ ذائقہ، تیل 2 کھانے کے چمچے، چیڈر چیز 2 سلائس

ترکیب: پہلے پین میں تھوڑا سا تیل گرم کر کے ایک کھانے کا چمچہ لہسن کا پیسٹ اور آدھا کلو جھینگو کو شیلو فرائی کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ اب ایک کڑاہی میں آدھا کلو دودھ ابالیں۔ جب دودھ ابلنے لگے تو تین یا چار کھانے کے چمچے بھنے میدے سے اسے گاڑھا کر لیں۔ جب دودھ گاڑھا ہو جائے تو اس میں آدھا چائے کا چمچہ اوریگانو، آدھا چائے کا چمچہ روزمیری، حسبِ ذائقہ نمک، ایک چائے کا چمچہ کٹی کالی مرچ، 2 عدد چیڈر چیز سلائس اور آدھا پیکٹ ابلی ہوئی میکرونی شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ آخر میں شیلو فرائی جھینگے شامل کر کے مکس کریں اور نکال کر سرو کریں۔

دہی پھلکی تڑکے والی

اجزا: مونگ کی دال کا آٹا آدھ پاؤ، دہی ایک پاؤ، کھانے کا سوڈا تھوڑا سا، کٹی لال مرچ ایک چائے کا چمچہ، ثابت زیرہ آدھا چائے کا چمچہ، پسی لال مرچ آدھا چائے کا چمچہ، تیل دو کھانے کے چمچے، تیل فرائی کے لیے، نمک حسب ذائقہ

ترکیب: ایک پیالے میں آدھ پاؤ مونگ کی دال کا آٹا، تھوڑا سا کھانے کا سوڈا، حسب ذائقہ نمک اور ایک چائے کا چمچہ کٹی لال مرچ شامل کر کے اچھی طرح سے مکس کر لیں۔ پھر اس میں پانی شامل کر کے گاڑھا آمیزہ تیار کر لیں۔

اب پین میں تیل گرم کر کے پھلکیوں کی شکل میں فرائی کر لیں۔ سنہری ہونے پر نکال کر پانی میں ڈال دیں تا کہ تیل نکل جائے اور پھلکیاں نرم ہو جائیں۔ ایک دوسرے پیالے میں ایک پاؤ دہی اور حسب ذائقہ نمک کو پھینٹ لیں۔

پھلکیاں ہلکے ہاتھ سے نچوڑ کر دہی میں ڈال دیں۔ پھر پین میں دو کھانے کے چمچے تیل، آدھ چائے کا چمچہ ثابت زیرہ، کٹی لال مرچ اور آدھ چائے کا چمچ پسی لال مرچ ڈال کر تڑکا تیار کریں اور پھلکیوں پر ڈال کر تڑکا لگائیں۔ مزے دار دہی پھلکی تڑکے والی تیار ہیں۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

انصاری اسماء بانو سلیم اختر

بریسٹ کینسر

(Breast Cancer)

انسانی جسم میں ہونے والے تمام خطرناک سرطانوں میں سے چھاتی کا سرطان بھی ایک ہے جو ہر روز ساری دنیا میں لاکھوں خواتین کو متاثر کر رہا ہے اور عورتوں کی شرح اموات میں اضافے کا ایک بہت بڑا سبب بنتا جا رہا ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق دنیا کی خواتین کی کل آبادی میں 16% عورتوں کو بریسٹ کینسر کا عارضہ لاحق ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق ہر سال تقریباً 5 لاکھ خواتین بریسٹ کینسر کے سبب موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں جبکہ دنیا بھر میں ہر آٹھویں خاتون اس مرض کا شکار ہوتی ہے اور ہر 3000 حاملہ خواتین میں سے 1 بریسٹ کینسر کا شکار ہوتی ہے۔ یہ مرض زیادہ تر پچاس سے ساٹھ سال کی عمر کے درمیان کی خواتین میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اب کم عمر خواتین بھی اس بیماری میں بہت تیزی سے مبتلا ہو رہی ہیں۔

ہندوستان میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر سال چھاتی کے سرطان کے تقریباً فی لاکھ 25 سے 30 ہزار کیس رپورٹ ہوتے ہیں اور تقریباً فی لاکھ 12 سے 15 ہزار خواتین اس موذی عفریت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ممبئی کے کینسر کے علاج اور تحقیق کے لیے مشہور ٹاٹا میموریل ہاسپٹل کی اعداد وشماریات کے مطابق ہندوستان میں چھاتی کے سرطان میں مبتلا خواتین کی تعداد میں ہر سال ایک لاکھ میں تیس کی اوسط سے اضافہ ہو رہا ہے اور ہر سال 4 ہزار کینسر کے نئے کیس اسپتال میں آتے ہیں۔

اکثر بریسٹ کینسر کی تشخیص ہونے کے بعد مریض اور اس کی فیملی ذہنی طور پر متاثر ہو جاتی ہے اور وہ مریض کے جینے کی امید چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اب طبی شعبہ کی شبانہ روز تحقیق وترقی کی بدولت تقریباً تمام اقسام کے سرطانوں کا خاطر خواہ علاج ممکن ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ بیماری کی تشخیص ابتدائی مراحل میں ہو جائے۔ زیادہ تر خواتین چھاتی کے سرطان کی بیماری اور علاج کے بارے میں معلومات کے فقدان کا شکار ہوتی ہیں۔ خواتین کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ان میں حیران کن تبدیلیاں اسی وجہ سے ہو رہی ہیں کہ ان میں بریسٹ کینسر کے مرض کا خدشہ ہے۔ ہمارے یہاں غربت عام ہے، جبکہ تعلیم کی کمی، نجی ہسپتالوں کے مہنگے علاج، سرکاری ہسپتالوں میں علاج ومعالجے کی ناکافی سہولتوں اور دیگر سماجی مسائل کی وجہ سے بروقت تشخیص نہیں ہو پاتی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر چھاتی کے سرطان کی تشخیص اس کے ابتدائی مراحل میں ہو جائے تو 98% مریضوں کا علاج ممکن ہے۔

خلیات کی ناقابو نشوونما اور تقسیم کا عمل سرطان کہلاتا ہے۔ چھاتی کے سرطان میں سرطانی خلیات پستان میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔ پستان دراصل غدود اور عضلات پر مشتمل نرم گوشوں اور باریک نالیوں کے مجموعے سے بنا ہوا عضو ہے۔ ہر گوشہ پھر مزید چھوٹے چھوٹے گوشوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کو فص (فصیص Lobes) کہا جاتا ہے۔ یہ فصیص پھر مزید چھوٹے بلبلہ نما اجسام بصلہ ڈکٹس (نالیاں Ducts) سے ملے ہوتے ہیں جہاں دودھ بنتا ہے جو باریک باریک نالیوں کے ذریعے نوکِ پستان یعنی نپل Nipple تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس بنیادی ساخت کے علاوہ پستان میں خون کی رگیں اور آبگونہ کی نالیاں بکثرت ہوتی ہیں۔ آبگونی نالیوں کو

انگریزی میں Lymph Vessels کہتے ہیں۔ یہ نالیاں آبگونہ یا آب زلال (لمف) کو جمع کرتی ہوئی آبگونی عقدوں تک لے جاتی ہیں۔ آبگونی عقدے چھوٹے چھوٹے گرہ نما اجسام ہوتے ہیں جو کہ تمام جسم میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

بریسٹ کینسر کی وجوہات

ہارمونز میں بے اعتدالی

ماہواری سے قبل جب ایک یا دونوں چھاتیوں میں درد محسوس ہو۔ تھکاوٹ، پیٹ میں گیس، سر میں درد، مزاج میں تیزی، افسردگی اور چڑچڑا پن نمایاں ہو تو اسے سنجیدگی سے لیں۔ یہ دراصل PMS ہے۔ یہ علامتیں دراصل خواتین کے جسم میں ہارمونز کا توازن بگڑنے کی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 74% خواتین ہارمونز کے عدم توازن کا شکار ہوتی ہیں۔

خواتین میں بریسٹ کینسر کی وجہ ان میں اسٹروجن نامی ہارمون کی زیادتی بتائی جاتی ہے۔ اسٹروجن دراصل شبق کو بیدار کرنے والا تولیدی ہارمون ہے جو مادہ کے اندر جنسی قبولیت پیدا کرتا ہے اور اس تولیدی ہارمون کا سب سے زیادہ ذخیرہ چھاتیوں اور بچہ دانی میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہارمون دیگر زہریلے مرکبات کو بھی آسانی سے دوست بنا لیتا ہے۔ تازہ ریسرچ سے پتہ چلا ہے کہ اسٹروجن کو محدود کرنے سے خواتین میں اس موذی مرض سے شفایابی کی علامات پیدا ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں خصوصی ورزش اور خوراک کو معیار بنایا گیا ہے تاکہ اسٹروج میں کمی لائی جاسکے۔

بریسٹ کینسر وراثتی کینسر بھی ہے

ایک تحقیق کے مطابق خواتین میں 10% بریسٹ کینسر وراثتی جنسیاتی نقائص کی وجہ سے ہوتا ہے جبکہ جنسیاتی نقائص کی حامل خواتین کی اپنی زندگی میں اس مرض کے ہونے کے 80% امکانات ہوتے ہیں۔ ہالی ووڈ کی آسکر ایوارڈ یافتہ اداکارہ انجلینا جولی نے بھی چند سال قبل بریسٹ کینسر کے ممکنہ خطرے کے باعث چھاتی کی سرجری کروائی تھی۔ ڈاکٹروں نے جولی کو بتایا تھا کہ اگر وہ سرجری سے گریز کریں گی تو بریسٹ کینسر میں مبتلا ہونے کا خدشہ 87% بڑھ جائے گا۔ دراصل جولی کو اپنی والدہ سے کینسر کا جین ورثے میں ملا تھا جو ایک دہائی تک کینسر سے لڑتے ہوئے 56 سال کی عمر میں انتقال کر گئیں تھیں۔ 2200 خواتین پر کی گئی ایک تحقیق کے مطابق ماہرین نے یہ واضح کیا ہے کہ اگر کوئی خاتون 35 سال کی عمر سے قبل چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے والدین اور بہن بھائیوں میں چھاتی، پھیپھڑوں، دماغ، پروسٹیٹ اور دیگر کینسر میں مبتلا ہونے کے خدشات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ خراب جینز جو کینسر کے خلاف مدافعت کرتے ہیں نسلوں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا وقت پر ان کی تشخیص انھیں کئی نسلوں میں منتقل ہونے سے روک سکتی ہے۔

ماحولیاتی آلودگی بھی ایک بڑا سبب ہے

ماحولیاتی آلودگی بھی کینسر ہونے کا ایک بڑا سبب ہے اور ڈاکٹروں کے مطابق بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی بھی دیگر کینسرز کی طرح چھاتی کینسر کے مرض بڑھنے کی ایک وجہ ہے۔ اس کے علاوہ جو خواتین ایسی جگہوں کے قریب رہتی ہیں جہاں کیمیائی اجزا کا اخراج ہوتا ہے انھیں بھی چھاتی کے کینسر کا خدشہ رہتا ہے جبکہ فصلوں میں کیڑے مار ادویات کا استعمال اور گھروں میں استعمال ہونے والی کیڑے مار ادویات بھی کینسر میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔

غذا کا غیر متوازن ہونا بھی ایک اہم وجہ ہے

مشرقی خواتین بالعموم خود سے زیادہ اپنے شوہر اور بچوں کی غذا کا خیال رکھتی ہیں لیکن خود اپنی غذا بہتر نہیں رکھتیں جس سے وہ دوسری کئی بیماریوں کی طرح کینسر کا شکار بھی ہو سکتی ہیں اس لیے متوازن غذا بھی بہت ضروری ہے۔ ماہرین کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ گوشت کو بھوننا ضروری ہے مگر بھنا ہوا گوشت کثرت سے استعمال کرنے کی عادت جسم کے اندر ایسی کیمیاوی تبدیلیاں لانے کا باعث بنتی ہے جس سے جسم کے بعض خلیے خود بخود متحرک ہو کر سرطان کے عمل کو دعوت دیتے ہیں۔ غذائی بداحتیاطی بھی کینسر کی وجوہات میں بہت زیادہ اہم ہے۔

کاسمیٹکس (Cosmetics) کا مسلسل استعمال:

ماہر ڈاکٹروں نے سرطان سے متاثرہ خواتین کی بافتوں کے مطالعہ کے بعد جسم میں پیرابنس کی موجودگی کو کینسر کا سبب قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حسن و زیبائش کے لیے Cosmetics کا مسلسل استعمال چھاتی کا سرطان پیدا کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ماہرین کے مطابق کاسمیٹکس مصنوعات کو دیر تک محفوظ کرنے والا کیمیائی مادہ پیرابنس چھاتی کے سرطان کا سبب بن رہا ہے۔

بلڈ پریشر اور ڈپریشن بھی بریسٹ کینسر پیدا کر سکتا ہے

امریکہ میں ہوئی ایک تحقیق کے مطابق طبی ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ تنہائی نہ صرف بلڈ پریشر اور ڈپریشن کا باعث بنتی ہے بلکہ خواتین میں بریسٹ کینسر کو بھی جنم دیتی ہے۔ اس تحقیق میں انکشاف کیا گیا ہے کہ تنہائی اور اکیلے پن کی شکار خواتین میں کینسر کی رسولیاں عام خواتین کی بہ نسبت تین گنا تیزی سے بنتی اور بڑھتی ہیں بلکہ اس سے قوت مدافعت بھی متاثر ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اور کون سی خواتین خطرے میں ہیں؟

☆ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ بریسٹ کینسر کے خطرات بڑھتے جاتے ہیں۔

☆ وہ خواتین جن کی ماہواری 12 سال کی عمر سے پہلے شروع ہوئی ہو اور 50 سال کی عمر کے بعد تک جاری ہو۔

☆ وہ خواتین جو بے اولاد ہیں یا جن کے پہلے بچے کی ولادت 30 سال کی عمر کے بعد ہوئی ہو یا پھر جو خواتین کثیر الاولاد ہیں۔

☆ وہ خواتین جنھوں نے مینو پاز (ایام یاس) کے بعد Hormone Replacement Therapy کرائی ہو یا کسی طرح کے اضافی ہارمون لیے ہوں۔

☆ وہ خواتین جو بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتی۔ وہ سب سے زیادہ خطرے میں ہیں۔

☆ وہ خواتین جو کئی سالوں تک بہت زیادہ مقدار میں مانع حمل ادویاتpills Contraceptive کا استعمال کرتی رہی ہوں۔

☆ بڑھتا ہوا وزن اور موٹاپا بھی بریسٹ کینسر کی وجوہات میں سے ایک ہے۔

☆ شراب، سگریٹ، تمباکو اور الکوحل کی عادی خواتین بھی خطرے میں ہیں اور وہ خواتین بھی جو مرغن غذائیں زیادہ مقدار میں استعمال کرتی ہیں۔

☆ وہ خواتین جن کی ایک پستان کی سرجری ہو چکی ہو انھیں دوسرے پستان میں ہونے کا خطرہ ہے۔

جہاں یہ مرض جان لیوا ہے وہیں خواتین کی ایک بڑی تعداد بریسٹ کینسر کی تمام کیفیات سے ناواقف ہیں۔لندن کاؤنٹی اسٹیفورڈ شائر کی کیلیے یونیورسٹی کے محققین نے ایک حالیہ تحقیق میں کینسر کی آٹھ خطرناک علامات کی شناخت کر لی ہے جو انھوں نے دنیا بھر کی 25 تحقیقات کو زیر مطالعہ رکھتے ہوئے کی ہے اور جو اس مرض میں مبتلا ہونے کے بارے میں واضح اشارے دیتی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان علامات کے واضح ہونے کی صورت میں جنس اور عمر کی قید کو نظر انداز کرتے ہوئے مریض پر فوری توجہ دیں اور متعلقہ ٹیسٹ لازمی کروائے جائیں۔

علامات

(1) کھانسی کے ساتھ خون آنا۔

(2) خون کی کمی

(3) پیشاب میں خون آنا۔

(4) فضلے کے ساتھ خون آنا۔

(5) خواتین کی چھاتی میں گانٹھ (رسولی) یا گومڑ بننا۔

(6)Rectal کے تجربہ میں پروسٹیٹ کینسر کی علامات۔

(7) خواتین کے پیشاب میں مخصوص ایام کے باوجود خون آنا۔

(8) نگلنے میں مشکلات۔

اس کے علاوہ اور بہت سی ظاہری علامات ہیں جو خواتین خود ذاتی طور پر معائنہ کر کے محسوس کر سکتی ہیں۔

☆ پستان(Breast) کی شکل یا سائز میں تبدیلی۔

☆ پستان میں سختی یا گانٹھ، گٹھلی وغیرہ محسوس ہونا۔

☆ نپل کا ٹیڑھا یا الٹا ہو جانا یا نپل سے کسی طرح کے مواد کا اخراج ہونا۔

☆ نپل کے ارد گرد دانے ظاہر ہونا۔

☆ پستان کی جلد پر گڑھوں یا جھریوں کا نمودار ہونا۔

☆ پستان کی جلد پر جلد جیسی ایک اور باریک تہہ کا بننا۔

☆ پستان کے دونوں اطراف کے درمیان واضح فرق ہو جانا۔

☆ پیٹ کے اوپر پستان کے ارد گرد کسی بھی حصے میں مسلسل درد رہنا۔

☆ بازوؤں اور پستان کے ارد گرد والی جلد پر زخم جیسے نشانات پیدا ہونا اور ان سے مواد وغیرہ کا اخراج ہونا۔

☆ بغل میں گٹھلی یا سوجن کا پیدا ہونا۔

☆ بازو کے بالائی حصے پر سوجن ہونا۔

☆ وزن بڑھنا، کمر پھیلنا۔

☆ ہڈیوں، جوڑوں اور جسم کے دیگر حصوں میں مسلسل درد رہنا۔

☆ سر میں مسلسل درد رہنا۔

محققین کا کہنا ہے کہ اگر ایک یا ایک سے زائد ایسی علامات پائی جائیں تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان علامات کے حامل 20 سے 1 فرد کو کینسر کا مرض لاحق ہوتا ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ ان علامات کی شناخت سے کینسر کی ابتدائی تشخیص ممکن ہو سکے گی اور فوری علاج سے مریض پر افاقے اور بتدریج بہتری کا بھی امکان ہوگا۔ چھاتی کے سرطان کے باعث پستان میں ہونے والی تبدیلیوں کا معائنہ کر کے ابتدائی مراحل میں ہی سرطان کا سراغ لگایا جا سکتا ہے اور فوری علاج کے ذریعے سرطان کو مزید پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے۔

معائنہ وعلاج

(1) ذاتی معائنہ/ ماہر ڈاکٹر کے ذریعے معائنہ

بریسٹ کینسر کے معائنے کے بھی کئی طریقے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے مریض کو ذاتی طور پر خود کا معائنہ کرنا چاہیے یا پھر کسی ماہر ڈاکٹر سے معائنہ کروانا چاہیے جو کہ ہاتھ سے محسوس کر کے بتا سکے کہ پستان میں کوئی گٹھلی یا سختی تو نہیں معلوم ہو رہی ہے۔

اس کے بعد خود مریض کو چاہیے کہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی پستانوں کا معائنہ کرے کہ کہیں دونوں پستان میں کوئی فرق تو نہیں دکھائی دے رہا۔ اس کے بعد کسی روشن کمرے میں کھڑے ہو کر ہاتھوں سے چھو کر ان کا معائنہ کریں۔ سیدھے پستان کو الٹے ہاتھ سے اور الٹے پستان کو سیدھے ہاتھ سے چیک کریں اور پوزیشن اس طرح ہونی چاہیے کہ جس سائیڈ سے چیک کر رہے ہیں وہ ہاتھ سر پر رکھ لیں۔ دونوں پستانوں کو اچھی طرح ہاتھوں سے محسوس کر کے دیکھیں کہ کہیں متعلقہ علامات تو نہیں ظاہر ہو رہی ہیں۔

(2) اسکریننگ/ میموگرام Screening/Memmogram

ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسی خواتین جن کی عمر پچاس سال یا اس سے زیادہ ہو ان کو مکمل طور پر سالانہ اسکریننگ کروانا چاہیے اور ان کے ساتھ ساتھ وہ خواتین جنھیں اپنی چھاتی میں کسی قسم کی گٹھلی محسوس ہو تو فوراً کسی مستند ریڈیولاجسٹ (Radiologist) سے رابطہ کریں تا کہ وقت پر تشخیص سے بیماری اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے مریض کو بچایا جا سکے۔

میموگرام دراصل پستان کا ایک ایکسرے ہوتا ہے۔ اس سے پستان میں آنے والی ان تبدیلیوں کا پتہ چل سکتا ہے جو اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ آپ یا آپ کے ڈاکٹر یا نرس کو ان کا احساس بھی نہیں ہو سکتا۔

میموگرام کس طرح کیا جاتا ہے؟ آپ ایکسرے مشین کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں اور اپنے پستان کو پلاسٹک کی دو پلیٹوں کے بیچ رکھتی ہیں۔ وہ پلیٹیں ہر ایک پستان کو دباتی ہیں تا کہ وہ چپٹا ہو جائے اور اچھی تصویر لی جائے۔

امریکن سوسائٹی آف کلینکل اونکالوجی کی سات ہزار خواتین پر کی گئی ایک تحقیق کے مطابق کبھی بریسٹ اسکریننگ اور میموگرام نہ کرانے والی خواتین میں مرنے کی شرح 56 فیصد تھی جبکہ معائنہ کرانے والی خواتین میں یہ شرح صرف 5 فی صد تھی۔ کیمبرج ہاسپٹل آف بریسٹ کینسر اور ہاورڈ میڈیکل اسکول کے ڈاکٹر بلیک کیڈی کا کہنا تھا کہ بریسٹ کینسر کی وجہ سے موت سے بچنے کے لیے موثر ترین طریقہ باقاعدہ اسکریننگ اور میمو گرام ہے۔

(3) بائیوپسی (Biopsy)

اگر آپ مزید معلومات چاہتے ہیں تو بائیوپسی کرتے ہیں۔ بائیوپسی میں دراصل متاثرہ پستان میں کٹ لگا کر گانٹھ lump میں سے مواد نکالا جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے لیبارٹری میں مائیکرو اسکوپ کے ذریعے چیک کیا جاتا ہے کہ یہ کینسر کی گانٹھ ہے یا کچھ اور ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بائیوپسی کرنے سے کینسر پھیل جاتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے اگر آپ بائیوپسی کرانے کے بعد یوں ہی بیٹھ جائیں گے تو ظاہر ہے مرض پھیلے گا۔ بائیوپسی کرانے کے بعد جو کینسر کا صحیح علاج ہے اگر وہ کروایا جائے تو مریض کے صحت مند ہونے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ الٹرا ساؤنڈ، MRI، نیوکلیئر میڈیسن، کلر ڈپلر اور 4D/3D وغیرہ سے بھی اب متعارف ہو چکے ہیں۔

علاج

چھاتی کا کینسر کا کوئی نیا مرض نہیں ہے بلکہ زمانہ قبل از مسیح میں بھی مصر میں ماہرین طب نے چھاتی کے کینسر میں مبتلا 12 مریض دریافت کر لیے تھے مگر اس وقت طریق علاج نہ جانے کیا ہو گا کیونکہ 1500ء میں سرجری کے ذریعے کینسر کو ختم کر دینے کا آغاز ہوا مگر ماہرین طب اس نتیجے پر پہنچے کہ سرجری کوئی حتمی، دائمی اور شافی علاج نہیں بلکہ وقتی طور پر مریض کی تکلیف دور ہو جاتی ہے اور کینسر کچھ مدت کے بعد پھر پھوٹ نکلتا ہے۔ تاہم اب تک کینسر پر قابو پانے کے باب میں بڑا کام تو ہو چکا ہے لیکن ابھی تک بعض پیچیدگیاں ناقابل فہم ہیں جن کو سمجھ لینے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ طبی تحقیقات کے سبب کینسر کا علاج کسی حد تک ممکن ہے اور مریض کی لمبی زندگی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس خطرناک مرض کے علاج کے لیے سب سے پہلے تشخیص، پھر ایک مستند ڈاکٹر سرجن سے تصدیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر بریسٹ کینسر اس کے مراحل دیکھ کر کیا جاتا ہے پوری دنیا میں بریسٹ کینسر کا علاج مندرجہ ذیل طریقوں سے ہی کیا جاتا ہے۔

1۔ ادویات: Tablets

کینسر کی ادویات جیسے Anastrozle, Tamoxifen وغیرہ دی جاتی ہیں۔

2۔ سرجری: Surgery

سرجری کے ذریعے یا تو گٹھلی یا گانٹھ کو نکالا جاتا ہے یا پھر پستان کو ہی نکال دیا جاتا ہے۔

3۔ کیموتھراپی: Chemotherapy

منہ کے ذریعے ادویات دی جاتی ہیں یا شریانوں میں ٹیکے کے

ذریعے جسم میں پہنچائی جاتی ہیں۔ تاہم کبھی کبھار کیموتھراپی جلد کے نیچے پٹھوں میں ٹیکے کے ذریعے بھی دی جاسکتی ہیں۔

4۔ ریڈیوتھراپی Radiotherapy

ریڈیوتھراپی میں طاقتور ایکس ریز کا استعمال کیا جاتا ہے۔ متاثرہ خلیات کو ضائع کرنے کے لیے۔ اس سے معمول کے خلیے بھی متاثر ہوسکتے ہیں لیکن یہ علاج ہونے کے بعد ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ یہ ریڈیوتھراپی کے لیے دی جاسکتی ہے یا یہ سرجری سے پہلے یا پھر سرجری کے بعد دی جاسکتی ہے۔ سرجری سے پہلے یہ رسولی کو چھوٹا کرسکتی ہے اور سرجری کے بعد یہ بچ جانے والے کینسر کے خلیات کو مارنے میں مدد کرتی ہے۔ بعض اوقات کیموتھراپی اور ریڈیوتھراپی میں بیک وقت دی جاتی ہیں۔

ریڈیوتھراپی کرنے سے پہلے ایک یا دو اسکین Scan کرانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے ڈاکٹروں کو یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملتی ہے کہ آپ کو کتنی ریڈیوتھراپی کی ضرورت ہے۔ مریض کے متاثرہ حصے کی جلد پر ایک چھوٹا سا مستقل ٹیٹو بھی بنادیا جاتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ریڈیو تھراپی کو کس عین مطابق جگہ پر دینا ہے۔

مردوں میں بریسٹ کینسر

یہ سچ ہے کہ بریسٹ کینسر کا شکار سب سے زیادہ خواتین ہی ہوتی ہیں لیکن مرد بھی اس مرض کا شکار ہوسکتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق اندازاً ایک ہزار مردوں میں سے ایک مرد بریسٹ کینسر کا شکار ہوتا ہے۔ تاہم خطرناک بات یہ ہے کہ زیادہ تر مردوں میں کینسر کی تشخیص آخری اسٹیج پر ہوتی ہے۔ ماہرین کے مطابق مردوں میں اپنے 'لائف اسٹائل' یا طرز زندگی کو بدلنے اور ڈاکٹروں سے طبی معائنہ کرانے میں ہچکچاہٹ ان میں خواتین کی بہ نسبت کینسر ہونے کے امکانات زیادہ ہونے کا سبب بن سکتے ہیں۔ اگرچہ خواتین کے مقابلے مرد حضرات کے بریسٹ کینسر میں ٹشوز کی مقدار کم اور چھوٹی ہوتی ہے جس کی وجہ سے کینسر کی تشخیص کرنا آسان ہوتا ہے۔

احتیاطی وحفاظتی تدابیر

☆ اپنے لائف اسٹائل یعنی رہن سہن میں تبدیلی لائیں۔ بدلتے دور میں اپنے طرز زندگی کو حد سے زیادہ اور ضرورت سے زیادہ بدلنا بھی بریسٹ کینسر کی وجہ بن سکتا ہے۔

☆ روزانہ کم از کم 30 منٹ تک چہل قدمی کریں اور وزن بالکل نہ بڑھنے دیں۔ گھر کے کام سے فارغ ہوکر مناسب ورزش کا اہتمام کریں۔ ماہرین کے مطابق ہفتے بھر میں 150 منٹ کی ورزش یا واک کی جائے تو اس مرض کو دوبارہ لاحق ہونے سے بہت حد تک بچا جاسکتا ہے۔ ورزش سے خلیات میں ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوتی اور وہ سرطانی ہونے سے بچے رہتے ہیں۔

☆ دھوپ میں نکلتے وقت سیاہ رنگ کے زیرجامے Underwear ہرگز نہ پہنیں فوم، نائلون اور خاص طور پر کالے رنگ کی برئز یر بھی چھاتی کے کینسر کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ کالا رنگ سورج سے کچھ ایسی خطرناک شعاعیں جذب کرتا ہے جو انسانی جلد اور خاص طور پر چھاتی کی جلد کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں اور چھاتیوں کے اوپر قمیص بھی ڈھیلی ڈھالی ہونی چاہیے۔

☆ خواتین اپنے شیرخوار بچوں کو ڈبے کا دودھ پلانے کے بجائے اپنا دودھ پلائیں۔

☆ زیادہ چکنائی اور گوشت سے پرہیز کریں، تازہ پھل، دالیں، گندم، باجرہ، مکئی کا آٹا اور ہری سبزیاں کھائیں۔

☆ گوشت میں مرغی اور مچھلی کو ترجیح دیں اور حتی الامکان بھاپ میں کھانا پکائیں اور گوشت کو آگ پر بھوننے سے گریز کریں۔

☆ 40 سال کی عمر میں ہر 2 سال اور 50 سال کے عمر کے بعد ہر سال باقاعدگی سے میموگرافی کروائیں۔

☆ کم از کم سال میں ایک مرتبہ اپنا معائنہ ضرور کروانا چاہیے۔

☆ یہ بہت ضروری ہے کہ مائیں اپنی بیٹیوں سے اس خطرناک مرض کے متعلق بات چیت کریں۔

☆ خواتین کی محفل میں بریسٹ کینسر کو زیر بحث لائیں تاکہ اس موذی مرض کے حوالے سے آگاہی کو فروغ دیا جائے۔

☆ خواتین ذاتی معائنے کو اپنی عادت بنائیں اور جیسے ہی کسی طرح کی تبدیلی محسوس ہو فوراً ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ کسی طرح کی شرمندگی اور جھجک محسوس نہ کریں۔

بریسٹ کینسر کو شکست دینا ممکن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ مکمل اعتماد سے اس کا مقابلہ کریں، مثبت رویہ اور سوچ رکھیں اور ہر دن کا آغاز یہ سوچ کر کریں کہ یہ آپ کی تندرستی کی طرف ایک اور قدم ہے۔ ہر دن بھرپور طریقے سے جئیں اور اپنا ہدف اور مقصد بنالیں کہ آپ نے اس جنگ میں سرخرو ہونا ہے۔ آپ نے بریسٹ کینسر کے خلاف یہ مقابلہ جیتنا ہے اور آپ کو صحت یاب ہونا ہے۔ ❑❑❑

Ansari Asma Bano Saleem Akhtar
H. No.16, Survey No. 374, Madina Park
Near Masood Masjid
Dhule- 424001 (M.S)

حسن کی نگہداشت

گھنگھریالے بالوں کو سیدھا اور سلکی بنانے کا زبردست نسخہ گھر میں ہی موجود تو پارلر کیوں جانا؟

ایلو ویرا جیل 2 کھانے کے چمچ، دودھ 2 کھانے کے چمچ، شہد 1 کھانے کا چمچ، وٹامن ای آئل/کوکونٹ آئل 1 کھانے کا چمچ

بالوں کی لمبائی کے حساب سے مقدار میں اضافہ کرلیں۔تمام اجزا کو گرینڈر میں مکس کرلیں۔ نہانے سے 25 منٹ پہلے بالوں میں لگا کر چھوڑ دیں۔25 منٹ بعد سر دھولیں۔

نمک سے بال لمبے گھنے کرنے کا حیرت انگیز ٹوٹکہ پہلی بار کے استعمال سے ناقابل یقین نتائج

بالوں کو لمبا کرنے کے لیے نمک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سب سے پہلے اپنے بالوں کو شیمپو سے دھولیں۔

اس کے بعد گیلے بالوں میں نمک چھڑک کر 10 سے 15 منٹ تک کے لیے مساج کریں۔ پھر دوبارہ اپنے بالوں کو دھولیں۔ اس عمل کو مہینے میں 2 بار کریں۔نتائج سے آپ خود حیران رہ جائیں گے۔

صرف ایک چٹکی پھٹکری سے کریں سر کی خشکی کا خاتمہ

آپ کے سر میں بھی خشکی ہوگئی ہے۔
اگر ایسا ہے تو صرف ایک چٹکی پھٹکری اور ایک چٹکی نمک شیمپو میں ملا کر سر دھونے سے خشکی دور ہوتی ہے۔

چہرے سے بدنما داغ دھبوں اور چھائیوں کے لیے نایاب اُبٹن گھر میں بنائیں اور فائدہ اٹھائیں

ہلدی اور گیہوں کا آٹا ہم وزن گائے کے کچے دودھ میں ملا کر چہرے پر بطور اُبٹن ملتے ہیں۔ یہ نہ صرف رنگ صاف کرتا ہے بلکہ داغوں اور چھائیوں کو دور کرتا ہے۔لیکن ہلدی گھر کے مصالحے والی نہ لیں۔

دودھ کی بالائی کا استعمال شروع کر دیں اور چہرے کو دلکش بنائیں بغیر کسی کریم کے

دلکش چہرے اور نکھری رنگت کے لیے دودھ کی بالائی کو خوب پھینٹ لیں۔گلاب کی پتیاں اور بادام کا پیسٹ بنا کر مکس کر لیں۔فریج میں رکھیں روزانہ چہرہ پر لگائیں۔کسی بھی کریم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اسکن وائٹنگ اور ٹائٹنگ ماسک گھر میں بنائیں اور چہرے کو کیمیکل والے ماسک سے بچائیں

دہی ایک کھانے کا چمچ، چاول کا آٹا ایک کھانے کا چمچ، زیتون کا تیل ایک چائے کا چمچ، خربوزے کا گودا ایک کھانے کا چمچ

تمام اجزاء کو اچھی طرح مکس کریں۔اپنے چہرے پر لگائیں۔ دس سے پندرہ منٹ بعد دھولیں۔ اس سے اسکن ٹائٹ اور وائٹ بھی ہوگی۔پہلی بار کے استعمال سے آپ فرق محسوس کریں گے۔

تربوز سے صرف 5 منٹ میں رنگ گورا کریں

تربوز کے چھلکے کا سفید حصہ ایک قاش کا چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔ پودینے کے چند پتے، کیری ایک عدد دھو کر چھلکے اور گٹھلی سمیت ایک تربوز کا ٹکڑا یعنی لال والا حصہ۔دہی دو کھانے کے چمچ۔تمام اجزا کو اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔اپنی جلد پر اسکرب کریں اور پانچ منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پانچ منٹ کے بعد واضح فرق آپ کے سامنے ہوگا۔

(بحوالہ:www.hamariweb.com)

□□□

تاثرات: نگرنگر سے

ماہنامہ 'خواتین دنیا' جون 2019 باصرہ نواز ہوا۔ رسالہ صوری، بصری اور معنوی اعتبار سے قابل رشک ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر نشاں زیدی سے لیا گیا میرا انٹرویو اور میرا مضمون "ریڈیو ڈرامہ ایک تعارف۔ حیدرآبادی نشرگاہ کا قیام۔ ریڈیو ڈرامہ میں حیدرآبادی خواتین قلمکاروں کا حصہ A.I.R کے حوالے سے" شامل ہے۔ دیگر تمام مشمولات بہت خوب ہیں۔ فی الحال میں بات کی شروعات اپنے ہی تعلق سے شروع کرتی ہوں۔

1۔ سب سے پہلے میں ڈاکٹر نشاں زیدی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انھوں نے سادہ سی بات چیت سے اتنی اہم معلومات اخذ کر کے مجھے قارئین کے روبرو کیا۔ نشاں زیدی ایک ذہین لڑکی ہے اچھی تخلیقی فنکارہ بھی ہے۔ اللہ انھیں روز افزوں ترقی عطا کرے۔ اس انٹرویو میں ایک مقام پر سہواً میری تاریخ پیدائش غلط درج ہوگئی ہے۔ میرا سنہ پیدائش 1950 ہے نا کہ 1960۔

2۔ دوسری اہم بات

میرا مضمون کافی طویل تھا۔ اس کا عنوان تھا 'ریڈیو ڈرامہ۔ ایک تعارف، حیدرآباد میں نشرگاہ کا قیام۔ ریڈیو ڈرامہ میں حیدرآبادی خواتین قلمکاروں کا حصہ A.I.R کے حوالے سے" رسالے کی گنجائش کے لحاظ سے میری مرضی سے ہی اسے ایڈیٹ کیا گیا اور "ریڈیو ڈرامہ۔ ایک تعارف' والا حصہ حذف کر دیا گیا۔ 'خواتین دنیا' کے لیے اس کا عنوان۔ 'حیدرآباد کی نشرگاہ کا قیام۔ ریڈیو ڈرامہ میں حیدرآبادی خواتین قلمکاروں کا حصہ' ہوگیا۔

مگر صفحہ (20) 'خواتین دنیا' میں کچھ سطور جو ذیل میں درج ہیں چھوٹ گئے ہیں جس سے متن کی تفہیم میں رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔

ملاحظہ کریں:

"(میں نے جیلانی بانو سے) بات کی یہ جاننے کے لیے کہ کیا انھوں نے ریڈیو ڈراموں پر مبنی کوئی مجموعہ مرتب کیا ہے۔ انھوں نے 'نفی' میں جواب دیا۔ پھر میں نے جناب منظور الامین صاحب سے بات کی۔ موصوف نے کچھ وقت لیا اور دوبارہ فون کر کے خود ہی (37) ڈراموں کے نام لکھوائے جو میں نے یہاں درج کیے ہیں۔"

شمارے کے دیگر مشمولات فکر انگیز ہیں۔ مضامین کے حصے میں ڈاکٹر مسرت جہاں کا مضمون 'اللہ میگھ دے کی تہذیبی اور عصری معنویت' اور غضنفر اقبال کا 'اردو افسانے کا تانیثی تناظر' دونوں بہت اچھے ہیں۔ دونوں بڑے محنتی اسکالرز ہیں۔ افسانوں کے زمرے میں تحسین کاظمی کا افسانہ 'جب صبح ہوئی' چڑیاں چگ گئیں کھیت والا معاملہ ہے۔ بڑی سبق آموز کہانی ہے۔ زن و شوہر کا رشتہ محض یقین کامل پر رکا ہوتا ہے۔ جہاں یقین ڈگمگایا کہ بدگمانی، دیمک بن کر گرہستی کو چاٹ جاتی ہے۔ عورت صرف بیوی نہیں ہوتی ماں بھی ہوتی ہے اور بہو بھی۔ میکے میں بیٹی بہن تو ہے ہی۔ خاندان ان سب سے ہی بنتا ہے۔ اک ذرا سی بدگمانی سے گھر کو کھنڈر بنانا مناسب بات نہیں۔ عصر حاضر میں بدگمانی، بدظنی کی راہیں بہت ہموار ہیں اس لیے عورت کو اپنے رشتے کی استقامت کے لیے بہت صبر و سکون اور سمجھداری کی ضرورت ہے۔ مذکورہ کہانی بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر شہناز یوسف کا 'باس' ایک ترقی پسند افسانہ ہے۔ بہت اچھا ہے۔ فرحت نادر رضوی کا 'دھندا' بگڑے ہوئے سماج کا آئینہ ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کیا کوئی ماں ایسی ہوسکتی ہے! کیونکہ ہوتی ہے۔ پریم چند کے 'کفن' میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اس موضوع پر بہت سے افسانے ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا طبقہ جس کے کردار ہماری اس کہانی کا حصہ ہیں وہ ہمارا یہ

لٹریچر پڑھ سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو ہم یہ کہانی کس کے لیے لکھ رہے ہیں؟ یا پھر کیا ہمارے باشعور سماج میں کچھ کردار اس قدر گرے ہوئے ہیں جو اپنے اعمال و افعال کو Camouflage کر کے مقصد براری کا اہتمام کرتے ہیں؟ ہاں ہیں جن سے آئے دن ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ جو بظاہر سفید چادر بچھا کر میت پر خیرات نہیں مانگتے بلکہ خون تک چوس لیتے ہیں۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ باقی شعری حصہ، پکوان اور صحت ان سب کی شمولیت اس رسالے کو خاندان Friendly بناتی ہے۔

قمر جمالی، راحت کدہ، ہاؤس، ہیما گری نگر کالونی، گنڈم گوڈا، حیدر آباد

"خواتین دنیا" جولائی 2019 موصول ہونے کے بعد اگلے شمارے کے انتظار میں اب تک بار بار زیر مطالعہ رہا ہے۔ سچ ہے حسین شمارے تاخیر سے ہمدست ہوتے ہیں۔ بنا انتظار کے تاخیر کا وجود کہاں اور مزہ کیا۔ زیر نظر شمارہ کے سرورق پر عظیم خواتین کی گروپ فوٹو سے ابتداء ہوئی ہے جبکہ اندرونی صفحات کوئی گیارہ شہ سُرخیوں میں منقسم ہیں۔ "مشعل" میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ انٹرنیٹ اور جدید ٹکنالوجی کے باوجود علم کا حقیقی خزانہ کتابوں ہی میں چھپا ہوا ہے۔ شخصیت کے ذیل میں "ملکۂ نور جہاں" (ص 5) پر لکھا گیا مضمون ہے۔ ص (8) پر نکہتِ سخن میں سب ہی اشعار قابلِ داد ہیں۔ جہانِ نسواں کے تحت کوئی سات مقالے درج ہیں جو فکر کو مہمیز کرتے ہیں۔ ان میں خواتین کی ناول نگاری (ص 9) چاہے سماجی ہو یا تاریخی پر پہلے بھی کافی کچھ لکھا جا چکا ہے، پھر بھی متاثر کن ہے۔ اسے ضرور پڑھیے۔ کہانیوں میں (ص 43) کے تحت تین کہانیاں درج ہیں۔ کہانی "بوجھ" (ص 45) اچھی کہانی ہے۔ حسن سخن (ص 51) کے ذیل میں غزلیں اور نظمیں قابل داد ہیں۔ لیکن ص 51 پر دی گئی غزلیں دل لبھا گئیں۔ باورچی خانہ (ص 53) میں لذیذ پکوان کے طریقے تیار ہیں۔ آزما کر دیکھ لیں۔ اسی طرح صحت (ص 55) میں نسوانی مسائل کے حل دیئے گئے ہیں اور صحت کے بعد آرائش و زیبائش کے لیے حسن کی نگہداشت (ص 57) کے طرز درج ہیں۔ اسی طرح ص (59) پر تاثرات اور ص (61) پر خواتین سے متعلق دل خوش کُن خبریں دی گئیں ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آخری صفحہ پر ڈاکٹر رمیش پوکھریال نِشنک، عزت مآب مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند کی ایک دردانگیز نظم بعنوان "درد کا سلسلہ" دی گئی ہے۔

ابھی یہ سلسلہ زیر تحریر ہی تھا کہ "خواتین دنیا" اگست 2019 کا شمارہ یوم آزادی کی سوغاتیں بشکل ترانے و آزادی کے افسانے سناتا آپہنچا۔ اس میں صنفی ترتیب تقریباً وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ منتخب اشعار میں نسیم سیّد کا یہ شعر قابل تعریف و قابل داد ہے ۔

خزاں کے بیج زمینوں میں بو کے بیٹھے ہیں
اور انتظار کسی موسمِ بہار کا ہے

(ص 10)

جشن آزادی (ص 11) میں دونوں مضامین نہایت مناسب ہیں جبکہ جہانِ نسواں میں "اُردو افسانے میں دلت مسائل" (ص 29) میں ندرت اور انوکھے پن کا احساس ہوا۔ پیش کش بھی بہت خوب ہے۔ ص (35) پر "خواتین کی ترقی میں مذہب کوئی رکاوٹ نہیں" میں اچھا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ کہانیاں بھی ماشاء اللہ بہت خوب ہیں اور ص (51) پر دی گئی غزلیں قابلِ قدر ہیں۔ دورانِ خون میں بہتری کے لیے عمدہ مسالجات بتائے گئے ہیں۔ (ص 55) پھر ص (57) پر چہرہ کو بارونق بنانے کے لیے آسان نسخے تجویز کیے گئے ہیں۔ خواتین خبرنامہ میں لڑکیوں کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کیا ہی حسین شمارہ ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ تمام تر رنگینیاں اوراق پر ثُریا و کہکشاں کا بُرادہ چھڑک دیا گیا ہو۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-11، اورنگ آباد، (مہاراشٹرا)

ماہنامہ خواتین دنیا جولائی 2019 کے ذریعے آپ نے قارئین کو جو جو اہم جانکاریاں دیں ان کے عنوانات ہیں: (1) اے ایم یو علی گڑھ کی تعلیم یافتہ انعم بنیں دہلی میں پہلی باحجاب خاتون جج (2) پہلی سعودی خاتون ہوا باز کا ہوائی اڈے پر پہنچنے پر شاندار استقبال (3) درد کا سلسلہ از ڈاکٹر رمیش پوکھریال (4) آدھی آبادی کے صحتی مسائل (5) ملکہ نور جہاں (6) سرورق پر آٹھ اہم چہرے: عصمت و عینی کے بیچ والی خاتون اور ان کے شوہر نامدار کی بہت یاد آتی ہے۔

ظہیر نیازی، بھر کنڈا، جھارکھنڈ

ماہ فروری کا 'خواتین دنیا' جگمگاتا ہوا دل و دماغ میں روشنی بھر گیا۔ رسالہ کو دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہیں رہی کیونکہ اس شمارے میں میری کہانی "ہم تیری منزل نہ تھے" شائع ہوئی اور اس کے لیے میں آپ کی بہت مشکور و ممنون ہوں۔ آپ کی محنت اور کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اس کی مقبولیت اور شہرت میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اردو ادب کی بقا کے لیے آپ جو کارنامے انجام دے رہے ہیں وہ قابل تحسین و قابل فخر ہیں۔ میں اللہ رب العزت سے دعا کرتی ہوں کہ 'خواتین دنیا' کی دلکش و رنگینی ہمیشہ قائم و دائم رہے اور یہ رسالہ قارئین کے دلوں پر ہمیشہ اپنی ان مٹ چھاپ چھوڑتا رہے۔

روبینہ ساگر روبی، اچلپور سٹی، ضلع امراوتی (ایم۔ایس)

خواتین خبرنامہ

سندھو نے رقم کی سنہری تاریخ

باسل (یواین آئی) روزنامہ راشٹریہ سہارا 26 اگست 2019۔ ہندوستان کی پی وی سندھو نے جاپان کی نوجومی اوکھارا کو اتوار کو یک طرفہ انداز میں 7-21، 7-21 سے شکست دے کر ورلڈ بیڈمنٹن چمپئن شپ میں طلائی تمغہ جیت کرنئی تاریخ رقم کی۔ سندھو نے بڑے ٹورنامنٹوں کے فائنل میں ہارنے کا قفل آخر آج توڑ دیا اور وہ ہندوستان کی بیڈمنٹن میں پہلی عالمی چمپئن بن گئیں۔ سندھو گذشتہ دو سال عالمی چمپئن شپ کے فائنل میں ہاری تھی لیکن اس بار انھوں نے کوئی غلطی نہیں کی اور زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے اوکھارا کو شکست سے دوچار کر دیا۔ اولمپک سلور فاتح سندھو کا عالمی چمپئن شپ میں یہ پانچواں تمغہ ہے۔ وہ اس سے پہلے دو چاندی اور دو کانسی کے تمغے جیت چکی ہیں۔ پانچویں سیڈ سندھو نے تیسری سیڈ اوکھارا کو 37 منٹ میں شکست دے کر ہندوستان میں جشن کی لہر دوڑا دی۔ سندھو کو 2016 کے ریو اولمپکس میں چاندی، 2017 کی عالمی چمپئن شپ میں چاندی، 2018 کے دولت مشترکہ کھیلوں میں چاندی اور 2018 کی عالمی چمپئن شپ میں بھی چاندی کا تمغہ ملا تھا لیکن انھوں نے اس وقت اپنے میڈل کا رنگ بدلتے ہوئے اسے پیلا کر دیا۔ سندھو کا 2019 میں یہ پہلا خطاب ہے اور یہ خطاب بھی انھیں عالمی چمپئن شپ میں ملا جس کا ہندوستان کو کئی سالوں سے انتظار تھا۔ سندھو نے فائنل میں جو مظاہرہ کیا وہ بے مثال تھا اور اس کارکردگی کو طویل عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔ اس طرح ہندوستانی بیڈمنٹن تاریخ میں 25 اگست 2019 کا دن سنہرے الفاظ میں درج ہو گیا۔ سندھو نے اس طرح گذشتہ آٹھ مہینے کے خطابی

خشک سالی شاندار انداز میں ختم کی۔ سندھو نے اپنی خطابی جیت سے ہندوستان کا پہلے عالمی بیڈمنٹن ٹائٹل کا خواب پورا کر دیا۔ ہندوستان کے ورلڈ بیڈمنٹن چمپئن شپ کی تاریخ میں اب کل 10 تمغے ہو گئے ہیں جن میں ایک طلائی، تین چاندی اور چھ کانسی شامل ہیں۔ ان 10 تمغوں میں اکیلے

سندھو کی پانچ تمغوں کی شراکت ہے۔ ہندوستان کی کسی عالمی چمپئن شپ میں یہ اب تک کی بہترین کارکردگی ہے۔ اس سے پہلے 2017 میں سندھو نے چاندی اور سائنا نہوال نے کانسی کا تمغہ جیتا تھا۔ اوکھارا جیسی کھلاڑی کو دونوں گیمز میں 7-21، 7-21 سے شکست دے کر سندھو نے ثابت کیا کہ وہ اگلے سال ہونے والے ٹوکیو اولمپکس میں طلائی تمغہ کی سب سے مضبوط دعوے دار رہیں گی۔ سندھو نے عالمی رینکنگ میں چوتھے نمبر کی کھلاڑی اوکھارا کے خلاف اپنا کیریئر ریکارڈ 7-9 کرلیا ہے۔ اولمپک سلور فاتح سندھو نے کوارٹر فائنل میں دنیا کی دوسرے نمبر کی کھلاڑی تائی پے کی تائی جو ینگ کو سیمی فائنل میں عالمی رینکنگ میں تیسرے نمبر کی کھلاڑی چین کی یوفی کو فائنل میں عالمی رینکنگ میں چوتھے نمبر کی کھلاڑی اوکھارا کو شکست دی۔ سندھو کا اس سال یہ دوسرا اور عالمی چمپئن شپ میں مسلسل تیسرا فائنل تھا۔ وہ اس سال اس سے پہلے انڈونیشیا اوپن کے فائنل میں پہنچیں تھیں۔ سندھو نے گذشتہ سال عالمی چمپئن شپ میں اور ورلڈ ٹور فائنلس میں بھی اوکھارا کو شکست دی تھی۔ عالمی چمپئن شپ میں 2017 اور 2018 میں چاندی کا تمغہ اور 2013 اور 2014 میں کانسی کا تمغہ جیت چکی سندھو نے خطابی مقابلے میں اوکھارا کے خلاف طوفانی شروعات کی اور مسلسل آٹھ پوائنٹس لے کر 1-8 کی برتری حاصل کر لی۔ اوکھارا نے جب اپنا دوسرا پوائنٹس حاصل کیا اس وقت سندھو کے 16 پوائنٹس ہو چکے تھے۔ جاپانی کھلاڑی ہندوستانی کھلاڑی کے جارحانہ کارکردگی کے سامنے مکمل طور پر بے بس ہو چکی تھیں۔ سندھو نے 7-21 پر پہلے گیم کو ختم کردیا۔

دیپا ملک کھیل رتن یافتہ پہلی خاتون ایتھلیٹ

نئی دہلی (ایجنسی) قومی تنظیم، پٹنہ 19 اگست 2019۔ دیپا ملک کھیل رتن حاصل کرنے والی پہلی خاتون پیرا ایتھلیٹ بن گئی ہیں۔ ہندوستانی حکومت نے ہفتہ کو دیپا کو ملک کے سب سے بڑا کھیل اعزاز راجیو گاندھی کھیل رتن ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ دیپا اس ایوارڈ کو حاصل کرنے والی دوسری پیرا ایتھلیٹ بن گئی ہیں۔ دیپا نے ریو پیرالمپک 2016 شاٹ پٹ (گولا پھینک) میں چاندی کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایشیائی کھیلوں میں بھالا پھینک اور شاٹ پٹ میں کانسہ جیت چکی ہیں۔ دیپا سپریم کھیل اعزاز پانے والی ملک کی دوسری پیرا۔ ایتھلیٹ کھلاڑی ہیں۔ اس سے پہلے بھالا پھینک کھلاڑی دیویدجھا جھریا کو 2017 میں اس اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ دیپا کے کمر سے نیچے کا حصہ مفلوج ہے، وہ فوج کے افسر کی بیوی اور دو بچوں کی ماں ہیں، 17 سال پہلے ریڑھ میں ٹیومر کی وجہ سے ان کا چلنا ناممکن ہوگیا تھا۔ دیپا کے 31

آپریشن کیے گئے جس کے لیے ان کی کمر اور پاؤں کے درمیان 183 ٹانکے لگے تھے۔ گولہ پھینک کے علاوہ دیپا نے بالا پھینک، سوئمنگ میں بھی حصہ لیا تھا، وہ بین الاقوامی مقابلوں میں سوئمنگ میں تمغہ جیت چکی ہیں۔ بالا پھینک، سوئمنگ میں بھی حصہ لیا تھا۔ بالا پھینک میں ان کے نام پر ایشیائی ریکارڈ ہے جبکہ گولہ پھینک دیں اور چکہ پھینک میں انھوں نے 2011 میں عالم چمپئن شپ میں چاندی کا تمغہ جیتا تھا۔ دیپا کھیل میں ہی آگے نہیں ہیں، وہ سماجی کام کرنے کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری بھی کرتی ہیں۔ سنگین بیماری میں مبتلا لوگوں کے لیے مہم بھی چلاتی ہیں اور سماجی اداروں کے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں، دیپا کو لکھنے کا شوق ہے۔ دیپا شاٹ پٹر کے علاوہ سومر، بائکر، جیولن اور ڈسکس تھرور بھی ہیں۔ دیپا نے 2009 میں شاٹ ڈال میں اپنا پہلا تمغہ (کانسہ) جیتا تھا۔ اس کے اگلے ہی سال ایسا کمال کیا کہ انگلینڈ میں شاٹ پٹ، ڈسکس تھرو اور جیولن تینوں میں گولڈ میڈل جیتے۔ اس سال دیپا کے ستارے بلندی پر رہے اور اس نے چین میں پیرا ایتھلیٹ ایشین گیمز میں کانسے کا تمغہ جیتا۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فسانہ عجائب

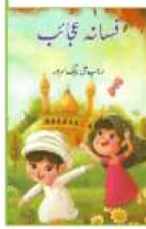

مصنف: رجب علی بیگ سرور

صفحات: 91

قیمت: 25 روپے

کیفیہ

مصنف: برج موہن دتاتریہ کیفی

صفحات: 294

قیمت: 140 روپے

ارباب نثر اردو

مصنف: سید محمد

صفحات: 247

قیمت: 135 روپے

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف: تاراچند

صفحات: 736

قیمت: 310 روپے

معاصر تنقیدی رویے

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 279

قیمت: 125 روپے

تفہیمات وترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

خودنوشت سوانح عمری: شیخ علی حزیں لاہجیؒ

ترجمہ وتقدیم: ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

صفحات: 136

قیمت: 85 روپے

مشاہیر ادبیات مشرق

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 292

قیمت: 145 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly October 2019, Vol.0 3, Issue: 10 **RNI. No. DELURD/2017/74026**
National Council for Promotion of Urdu Language **ISSN 2581-4826**
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025